طلوعِ مشرق

علامہ اقبالؒ کے منتخب فارسی کلام کا منظوم ترجمہ

مترجم
مضطر مجاز

طلوعِ مشرق

یعنی

علامہ اقبالؒ کی مثنوی "پس چہ باید کرد" اور مناجاتِ "جاوید نامہ" کا

منظوم اُردو ترجمہ

مترجم

مضطرؔ مجاز

ناشر

اُنا (انجمنِ نمودِ ادب) پبلیکیشنز حیدرآباد-۲۴

کتابت :۔ محمد عبدالقادر "زرین رقم"

طباعت :۔ کاظمی پرنٹنگ پریس، دارالشفاء، حیدرآباد، ۲۴

سرورق :۔ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

تعداد اشاعت :۔ (۵۰۰) پانچ سو

تاریخ اشاعت :۔ دسمبر ۱۹۷۵ء (بار اول)

قیمت :۔ آٹھ روپیہ سکہ ہند

(جملہ حقوق بحق مترجم محفوظ)

ملنے کے پتے

۱۔ انا پبلیکیشنز، ۱۲۹ ۔ کمہار واڑی کالونی، عیدی بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۲۳

۲۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو، کنار اہنگ، عابد روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

۳۔ نیشنل بک ڈپو، چارکمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

۴۔ ادارہ "برگ آوارہ"، ترپ بازار، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

۵۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

۶۔ مضطر مجاز، ۱۶-۵-۲۱، فرحت نگر، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴

فہرست

نشان سلسلہ	عنوانات	صفحہ نمبر
۱ -	کچھ ترجمہ کے بارے میں	مترجم
۲ -	مقدمہ	جناب ضیاء الدین احمد شکیب
۳ -	اس کتاب کے قاری سے	(پس چہ باید کرد)
۴ -	مناجات	(جاوید نامہ) ۱
۵ -	تمہید	(پس چہ باید کرد) ۹
۶ -	خطاب بہ مہر عالم تاب	(〃) ۱۴
۷ -	حکمت کلیمی	(〃) ۱۶
۸ -	حکمت فرعونی	(〃) ۲۱
۹ -	لا الہ الا اللہ	(〃) ۲۵
۱۰ -	فقر	(〃) ۳۰
۱۱ -	مردِ حرُ	(〃) ۴۱

۱۲ - اسرارِ شریعت میں (پس چہ باید کرد) ۴۶

۱۳ - ہندوستانیوں کی پھوٹ پر چند آنسو (") ۵۲

۱۴ - سیاسیات حاضرہ (") ۵۷

۱۵ - امّت عربیہ سے خطاب (") ۶۴

۱۶ - پس کیا کیا چاہیئے اقوام شرق (") ۷۰

۱۷ - حضورِ رسالت مآبؐ میں (") ۸۰

۱۸ - تلمیحات و تشریحات ۸۹

کچھ ترجمہ کے بارے میں

تخلیق کے مقابل ترجمہ کہیں زیادہ پیچیدہ اور مشکل نیم تخلیقی عمل ہے کیونکہ تخلیق تو ایک طرح سے جبری اور فطری تقاضے کا نتیجہ ہوتی ہے جیسے کہ غالب نے کہا ہے ؎

شعر خود کردہ تقاضائے کہ گردد فنِ ما

لیکن ترجمہ میں یہ عمل الٹا ہو جاتا ہے اور فن کو شعر کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ جذبہ کی جولانی، فکر کی فرازی، خیال کا خروش اور فن کی فسوں کاری جب تخلیق کار پر اپنی پوری تازہ دم فوج کے ساتھ شب خون مارتے ہیں تو تخلیق کار کی شخصیت اور اسکی استطاعت کے مطابق اچھی یا بری، متوسط یا ادنیٰ ایک تخلیق ظہور پذیر ہوتی ہے۔ مذکورہ عوامل دماغ کے رگ و ریشہ میں معلوم نہیں کیا کیا پُراسرار کیمیائی اور طبیعی تعاملات پیدا کرتے ہیں، شعور، تحتِ شعور اور لاشعور کے تاریک سمندروں میں کون کونسی ٹھنڈی اور گرم بحری رووں کو حرکت میں لاتے ہیں کہ "شاہ نامہ" "رامائن" "جاوید نامہ" "فاوسٹ" "فردوس گم شدہ" اور "ویسٹ لینڈ" جیسی تخلیقات عالمی ادب کا ایک انمٹ، انمول اور لازوال سرمایہ بن کر زندہ جاوید ہو جاتی ہیں۔ لیکن غریب مترجم ان تمام نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ جو بھی کیفیات اس پر گذرتی ہیں وہ صرف تخلیق کے واسطہ ہی سے اس تک پہونچتی ہیں، جو ظاہر ہیکہ ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ یہہ بات تقریباً ناممکن سی ہے کہ تخلیق کار جس کیفیت و کرب سے گذر چکا ہے اسی سے مترجم بھی ہمکنار ہو اور اگر بالفرض یہ ہو بھی جائے تو زبان کا پردہ حجابِ اکبر بن کر اسکی راہ کا روڑہ بن جاتا ہے اور یہیں سے مترجم کی مشکل شروع ہو جاتی ہے۔ اگر مترجم اس کڑے وقت سے سہل گذر جائے تو اسی میں اسکی نجات ہے ورنہ ترجمہ محض ترجمانی بن کر رہ جاتا ہے یا مترجم کی اپنی ہی کوئی تخلیق جو اصل تخلیق کا خوبصورت یا بھونڈا چربہ ہی کہلا سکتی ہے، ترجمہ نہیں۔ ترجمہ کا پہلا اور آخری اصول اس کا اصل سے "صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو" مطابق ہونا ہے اور ظاہر ہے یہ کسی جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں بہت کم ترجمے اس شرط پر پورے اتر سکتے ہیں۔ اقبال نے بھی "بانگِ درا" میں جو مغربی شعرا کی نظموں کے ترجمے

کئے ہیں انھیں ترجمہ نہیں بلکہ "ماخوذ" کہا ہے وہ اقبال کی اپنی نظمیں ہیں جن کا مرکزی خیال مستعار ہے۔ اردو میں نظم طباطبائی کی گورِ غریباں ترجمے کی دنیا میں کسی اعجاز سے کم نہیں میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ میرا یہ ترجمہ ہر طرح سے مکمل ہے۔ اس میں خوب سے خوب تر بنائے جانے کی یقیناً گنجائش موجود ہے۔
یہ ترجمہ اگرچہ میں نے بہت دن پہلے کیا تھا مگر مکروہاتِ دنیوی نے اس پر مزید غور و تفحص کا موقع نہیں دیا اور بوجوہ ناشرینِ کرام کو بھی مزید تعویق گوارا نہ تھی نتیجتاً اسے یونہی پریس کے حوالے کر دینا پڑا۔ اس ترجمہ میں میں نے زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات کی کی ہے کہ اقبال کا وہ لب و لہجہ اور ڈکشن برقرار رہے جو اسکے بیشتر اردو کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ یہ ڈکشن ہماری آج تک کی اردو شاعری سے کسقدر مختلف، منفرد اور موجودہ معیارات کے لحاظ سے خاصہ فارسی آمیز اور دقت پسندانہ ہے۔ ظاہر ہے، جیسا کہ ڈاکٹر عبداللہ نے کہا ہے کہ اقبال کے ہاں جو کہنے کے لئے باتیں تھیں وہ اتنی عظیم اور گمبھیر تھیں کہ اودھ کی بیگماتی زبان اسکے لئے قطعی موزوں و مناسب نہ تھی چنانچہ ترجمہ کرتے وقت بھی مجھے اس مشکل سے دوچار ہونا پڑا لیکن مجھے یقین ہیکہ یہ ترجمہ اقبال کے ان قارئین کے لئے اتنا اجنبی نہیں رہے گا جو اقبال کے اردو کلام سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ بہرحال میں اپنی اس حقیر کوشش کو اقبال صدی تقاریب کے موقع پر جو ۱۹۷۶ء میں عالمی طور پر منائی جا رہی ہیں علامۂ مشرق کی خدمت میں ایک نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ کشتِ اردو جو اقبال کے اس بارانِ رحمت سے محروم رہی ہے۔ سرسبز اور زرخیز ہوگی بشرطیکہ ترجمہ میں وہ "نمی" بھی ہو جسکی سرسبزی اور زرخیزی متقاضی ہے اور اسکا فیصلہ اہلِ علم و ادب زیادہ بہتر طریقہ سے کر سکیں گے۔
میں اُن تمام اہلِ علم و ادب اور ماہرینِ اقبال کا شکرگذار ہوں جن کا ان تراجم کے تعلق سے اظہارِ پسندیدگی میری حوصلہ افزائی کا باعث ہوا میں سب سے پہلے اپنے احباب جناب احمد قادری صاحب اور مصلح الدین سعدی صاحب کا اُن کے مفید مشوروں کے لئے تہہ دل سے ممنون ہوں جناب موہن شاد صاحب اور سید حسین صاحب نے جو خاموش کام اسکی اشاعت کے ضمن میں انجام دیا ہے وہ میرے لئے ان کے خلوص اور محبت کا بہت بڑا سرمایہ ہے میں اپنے عزیز دوست جناب احمد علی خاں صاحب کے اُن احسانات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا

جو اس کتاب کی شکل میں اپنی تمام صوری خوبیوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے اور وہ کام جو چودہ پندرہ سال سے نذرِ طاقِ نسیاں ہو چکا تھا سامنے آسکا۔ اسکے اظہار تشکر کیلئے شائد مجھے الفاظ نہ ملیں۔

اس کتاب کے کاتب جناب محمد عبدالقادر صاحب، زرین رقم کا بھی میں مشکور ہوں، جنھوں نے تین چار روز کی مختصر مدت میں پوری تندہی اور محنت کے ساتھ اسقدر خوبصورت اور عمدہ کتابت سے کتاب کے صوری حسن میں اضافہ فرمایا۔ مالکان و کارکنانِ کاظمی پرنٹنگ پریس اور نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کا کتاب اور سرورق کی برقت طباعت کیلئے شکریہ ادا نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی

سب سے آخر میں میں اپنے نوجوان اور عزیز دوستوں ڈاکٹر یوسف کمال اور ذکی بلگرامی صاحبان کا دلی شکریہ ادا کئے بغیر اس تحریر کو ختم نہیں کر سکتا کہ یہ ہر دو رفیق کتابت اور طباعت کے تمام مراحل میں ایسی محبت اور سرگرمی سے دلچسپی نہ لیتے تو شائد یہ کام اسقدر جلد مکمل نہ ہوتا، ڈاکٹر یوسف کمال پچھلے تین چار سال سے میرے اس کام کی اشاعت کے لئے بڑے مضطرب اور بے چین تھے۔ یہ اُن کا صدقِ اخلاص تھا کہ اُن کی محنتیں اور دلچسپیاں بار آور ہوئیں۔ میں اپنے دیرینہ "رفیق، فلسفی اور رہنما" جناب ضیاء الدین احمد شکیب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں علمی اور تحقیقی مصروفیات کے باوجود ان تراجم کے "مقدمہ" کے لئے ایسا فکر انگیز مقالہ تحریر فرمایا جو فکرِ اقبال کی تقریباً ساری تاریخی اور شعوری جہتوں کا پس منظر پیش کرتا ہے۔ فقط

مضطر مجاز

۲۱ - فرحت نگر
حیدر آباد - ۲۴
۲۶ / دسمبر ۱۹۷۵ء

مقدمہ

(ضیاء الدین احمد شکیب)

(۱)

ایک وسیع تر عالمی تمدن کی تشکیل میں مشرق و مغرب کی قوموں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ لیکن ابھی یہ عظیم الشان انسانی مہم ادھوری ہے۔ انسانیت کی تاریخِ تمدن میں مشرق کا جو دول ہے اُسے نہ صرف یہ کہ اوّلیت کا شرف حاصل ہے بلکہ علوم و فنون میں جس دوربینی کے ساتھ مشرقی اقوام نے جولانی دکھائی اس کی مثال یورپ میں نہیں ملتی۔ مشرق نے انسانیت کو جو اہم تحفے دیئے ہیں ان میں تمام بڑے مذاہب، اور اُن کے وسیلے سے فلسفہ، اخلاق، شعروادب، سائینس و حکمت اور فنون لطیفہ کا وہ ورثہ شامل ہے جو عالمی تمدن کی بنیاد میں اہم جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغربی فکر کا تمام تر انحصار یونان و روم کے دانش وروں کے فکری ورثے پر ہے، جسے ایک وسیع اصطلاح "ہیلنزم" سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تیسری صدی قبل مسیح سے موجودہ زمانے تک مشرق اور مغرب میں سیاسی عروج و زوال کے ساتھ ساتھ افکار و اقدار کا بڑے پیمانے پر تبادلہ ہوا۔ مشرق نے ہمیشہ مذہب، روحانیت اور شخصیت کی تعمیر کے عظیم الشان درس دیئے جبکہ مغرب نے مادیت، معروضیت اور ہیئت طرازی کے جوہر دکھائے۔ مغربی ہیئتیں اُس وقت تک بیکار محض ہیں، جب تک ان میں مشرق کی طرح اعلےٰ اقدار کی پذیرائی کی صلاحیت پیدا نہ ہو۔ اسی طرح، مشرقی اقدار

قابلِ عمل ہیئتوں کے بغیر تصوریت کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ اس تال میل کی کوشش متکلمین اور اشاعرہ کے دور سے زمانۂ حال تک اسلامی مفکرین نے مختلف انداز میں کی ہے۔

(۲)

ہندوستان اور بالخصوص عالمِ اسلام میں مذہبی اور سیاسی قیادت علماء ہی کے ہاتھ میں رہی ہے۔ یہ کیفیت اس زمانے تک باقی رہی جب تک کہ اقتدار کی باگ ڈور بادشاہوں کے ہاتھ میں رہی۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط سے تمام عالمِ مشرق میں شاہی ادارہ کمزور پڑ چکا تھا، جس کا ایک اہم سبب مغربی اقوام خاص کر انگریزوں کا استیلا تھا۔ برطانوی ملوکیت نے نہ صرف مشرق کی سیاسی قوتوں کو مغلوب کر لیا تھا، بلکہ اپنے ساتھ وہ ایک ایسا نظام فکری بھی لائے جس کی تابانی کے آگے مشرقی علوم، جو ایک عرصے سے جامد ہو کر رہ گئے تھے، غیر سود مند اور ناقابلِ عمل محسوس ہونے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مشرقی مفکرین نے برطانوی فکر اور استیلا کے مقابلے کے لئے کمر باندھی۔ ایسی سب سے پہلی تحریک غالباً سید احمد شہیدؒ اور سید اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک تھی جو وھابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے تین پہلو تھے :-

(۱) سماجی اصلاح کی مہم جو ان کے "خطبات" اور "صراط مستقیم" سے ظاہر ہے۔

(۲) سیاسی اور عسکری تنظیم۔ جس کا مقصد برطانوی اقتدار کا تختہ الٹنا تھا۔

(۳) اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید، جو ان کی معرکتہ الآراء کتاب "عبقات" میں کسی حد تک پیش ہوئی ہے۔

اسماعیل شہیدؒ کے تینوں نسخے اعلیٰ درجے کے اجزاء سے بنائے گئے تھے، لیکن ہندوستانی حالات میں یہ بعد از وقت تھے۔ اُن کی تحریک

اعلیٰ درجے کی تصوریت کو روبعمل لانے کی ایک جذباتی مہم تھی۔ جہاں تک سماجی اور تہذیبی اصلاح کا تعلق تھا، ہندوستان کی معاشرت انحطاط پذیر سرمایہ داری کے دلدل میں سڑ رہی تھی اور یہ ممکن نہیں تھا کہ نری اعلیٰ درجے کی تصوریت کا چراغ دکھا کر اس کو فکر و عمل کے اندھیرے سے باہر نکالا جا سکے۔ اس تحریک کا اثر چند خاص افراد کی حد تک ممکن تھا جو ہوا۔

ہندوستانی معاشرت کی اصلاح کے لئے مغربی نظامِ تعلیم، نظامِ عدلیہ، اصولِ نظم و نسق، رسل و رسائل اور آئینِ حکمرانی، جو ماحول پیدا کر رہے تھے، اسکا اندازہ اسماعیل شہیدؒ کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اُن کی سیاسی تحریک اپنے مخلصانہ جذبات اور جانفروشی کے باوجود جدید ترین فنِ حرب سے آراستہ برطانوی اقتدار کا مقابلہ نہ کر سکی اور اُس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔

تیسرا پہلو تصوریت کا تھا جو ایک طرح سے معاشرے کے نفس اور اس کی روحانیت میں ایک زبردست انقلاب لانے کی کوشش پر مشتمل تھا لیکن ایک طرف نہ تو معاشرہ اس قدر زبردست تصوریت کا متحمل اور مکلف تھا نہ ہی دوسری طرف "عبقات" اور "تقویت الایمان" یا روسو کے "معاہدۂ عمرانی" ان سائینسی عوامل کا جواب ہو سکتے تھے جو مغرب میں صنعتی انقلاب برپا کر رہے تھے۔ بہر حال یہ تاریخ کا ایک ایسا لمحہ تھا جب مشرق اور مغرب کا ظاہری تصادم ایک نئی نوعیت کے تہذیبی تال میل اور مفاہمت کا متقاضی تھا۔ ایسے میں مشرق کو مغرب سے بہت کچھ قبول کرنا تھا۔ یہ کام "آئینِ نو سے ڈرنے" اور "طرزِ کہن پر اڑنے" سے ممکن نہیں تھا۔ مگر یہ سچ ہے کہ یہ منزل کٹھن تھی۔

سارے عالمِ مشرق میں سب سے پہلے اس نازک لمحے کے اقتضاد کو جس نے ٹھیک طور پر سمجھا وہ راجہ رام موہن رائے اور سرسید تھے۔ دونوں نے

نئے حالات سے اندھا دھند الجھنے کے بجائے مفاہمت کا فیصلہ کیا۔ تاہم راجہ رام موہن رائے کی مفاہمت میں صرف ہندوستانی ماحول اور معاشرت پیشِ نظر تھی اور اس میں انفعالیت زیادہ تھی۔ مزید یہ کہ راجہ رام موہن رائے نے کسی ادویت مفکر کی طرح کوئی مجتہدانہ نظریاتی انکشاف نہیں کیا اگرچہ سرسید کی تحریک بھی ہندوستانی حالات ہی کے پیشِ نظر متشکل ہوئی لیکن اس میں تمام عالمِ اسلام کے مسائل کا حل اور مشرقی اور مغربی متصادم عناصر میں سمجھوتے کے ایسے اصول مضمر تھے جو مسلمانوں کے علاوہ دوسری تمام مشرقی قوموں کے لئے یکساں طور پر قابلِ عمل تھے۔ سرسید نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ سائنسی فکر، مذہبی فکر و کردار کے منافی نہیں ہے، بلکہ اس کے عین مطابق ہے۔ اسی طرزِ فکر نے سارے ایشیا میں ایک ایسے رجحان کی بنا ڈالی جسے جدید و قدیم کے امتزاج یا ماڈرن ازم کی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ماڈرن ازم کے فروغ کے ساتھ ساتھ مذہبی فکر و قیادت اور سیاسی فکر و قیادت میں فرق پڑنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ شاہی سے چھٹکارا پانے اور جمہوریت کے حصول کی لگن پیدا ہوئی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آخر سے تمام ایشیا میں اور خاص طور پر عالمِ اسلام میں اور اس سے بھی پہلے ہندوستان میں مذہبی علماء کی موجودگی کے باوجود خالص سیاسی قیادت اُبھرنے لگی۔ ان سیاسی قائدین کا طرزِ فکر و عمل ایک خاص انداز کا تھا۔ ان لوگوں کی تعلیم اور سیاسی جدوجہد مغربی وضع کی تھی جس پر بعض صورتوں میں لادینی کا بھی شبہ کیا جاسکتا تھا لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ ان کی سیاسی کاوش مذہب ہی کے نام پر ہوتی تھی۔ ایسی قیادت نے ہر مذہب میں علماء کے ایک ہم نوا زُمرے کو اپنے ساتھ لیا۔ تاہم ہندوستانی مفکرین کو فی الفور جو مسئلہ درپیش تھا وہ مذہب و سیاست کے درمیان مصالحت کی راہیں ڈھونڈنے کا نہیں بلکہ برطانوی استیلا سے نجات حاصل کرنے کا تھا۔ انہی

مفکرین میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی موجود تھیں جو مفاہمت پر آمادہ نہیں تھیں۔ ان میں جمال الدین افغانی کا نام سرِ فہرست ہے۔

(۳)

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہندوستانی سیاست اور دانش کے جو رہ نما اصول اُبھرے ہیں ان کے مدوّن کرنے والوں میں اکثریت ان کی تھی جنھوں نے مغرب میں تعلیم پائی۔ جن کے ذہن، حکیمانِ فرنگ کے درس سے روشن تھے۔ لیکن جن کے سینوں میں مشرقی روحانیت کی خدمت کرنے کی تپش بھی باقی تھی۔ مغرب کی لادینی پر یہ لوگ رنج محسوس کرتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اقبالؔ نے آنکھ کھولی اور اسی صدی کے وسط سے وہ ایک ایسے مفکّر کی حیثیت سے اُبھرے جو علومِ شرق و غرب پڑھ لینے کے باوجود، اپنے سینے میں ایک درد و کرب محسوس کرتا تھا۔ یہی درد و کرب گاندھی جی کے سینے میں بھی تھا اور رابندر ناتھ ٹیگور کے دل میں بھی۔ ان کے علاوہ بھی ہندوستان میں اور بہت سے مفکّرین ہوئے ہیں، لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ان تینوں کے خوشہ چین تھے یا پھر اُن کی انفعالی فکر عملی طور پر اہمیّت حاصل نہ کر سکی۔ ان تینوں مفکرین نے جدوجہد آزادی میں بھی اپنا حصّہ ادا کیا اور اپنے فکر و نظر کا بھی ایک عظیم الشان سرمایہ پیش کیا ہے۔ اپنے عمل اور تصوّر کی جدوجہد میں گاندھی جی بہت آگے نکل گئے، لیکن جہاں تک ان کی فکر اور تصوریت کا تعلق ہے اس کی عمل پذیری کیلئے پتہ نہیں اور کتنی صدیاں درکار ہونگی۔ یہی حال ٹیگور کی فکر کا بھی تھا۔ یہ دونوں نہ صرف ایک غیر طبقہ دار سماج اور غیر فرقہ وارانہ حکومت دیکھنے کے خواہاں تھے، بلکہ وہ ساری انسانیت کو ایک بغیر مملکت کے سماج کی صورت میں یکجا دیکھنا چاہتے تھے۔ ایسی ہی تصوریت مغرب میں کارل مارکس کا منتہائے فکر تھی۔ مارکس کی فکر چونکہ بنیادی طور پر مادّی تھی اور اس کی اس بے پناہ تصوریت کے باوجود مارکس ازم کے منشور

کے عملی امکانات اس قدر قوی اور موثر تھے کہ ۱۹۱۷ء کے "اکتوبر انقلاب" کے بعد اشتراکیت نے تمام عالمی مفکرین کو بھونچکا سا کر کے رکھ دیا۔ اس کا اثر ہندوستانی مفکرین پر بھی پڑا۔ ٹیگور نے اپنی تصوریت کو کارل مارکس کے تصورات سے ہمکنار کر دیا تھا اور انھیں، مزدور کے عرقِ پیشانی میں جلوۂ ایزدی دکھائی دینے لگا۔ اقبالؔ اور گاندھی جی نے اشتراکیت سے ایک مختلف انداز میں اثر قبول کیا۔ ان تینوں ہندوستانی مفکرین نے بہر حال فکر کو مذہب سے آزاد کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ تاہم اُن کے یہاں مذہب کی تعبیریں بدلتی گئیں۔ اقبالؔ مغرب کی مطلق تصوریت سے واقف تھے اور وہ اپنی فکر کو اُس کے حوالے کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے قابلِ عمل تصوریت کو اسلام میں محسوس کیا۔ دیکھا جائے تو یہ ایک طرح سے سرسیدؔ کے طرزِ فکر کا نقطۂ معراج تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ نہ مشرق سے بیزار ہونے کی ضرورت ہے نہ مغرب سے حذر کرنے کی۔ انھوں نے مشرق ہو یا مغرب، دونوں کے اندھیرے کو دُور کرنے کی ٹھان لی۔ سچ تو یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی فکر کے امتزاج کا یہ ایک اور تاریخی مرحلہ تھا جس میں اقبالؔ نے اپنا قابلِ لحاظ حصہ ادا کیا۔ اس کے لئے انھوں نے اپنے وہ دقیق خطبات بھی پیش کئے جو "حرفِ پیچا پیچ" اور "حرفِ نیش دار" پر مشتمل ہیں اور اپنی شاعری سے بھی پیام رسانی کا کام لیا۔ اپنی زندگی کے آخری دَور میں وہ سیاسی اور عمرانی مسائل پر گہری توجہ دینے لگے تھے۔ وہ جہاں ایک طرف اس بات کے خواہاں تھے کہ ساری انسانیت ایسی مادّی ترقی کرے جیسی کہ یورپ نے کی تھی تو دوسری طرف وہ اسے اعلیٰ روحانی مقامات تک بھی پہونچانا چاہتے تھے۔ اُن کے اوّل الذکر پہلو کی نمایندگی "ضربِ کلیم" کرتی ہے۔ مؤخر الذکر پہلو کی ترجمانی ان کی فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد" سے ہوتی ہے۔

"پس چہ باید کرد" ایک مختصر اور پُر سوز مثنوی ہے، جس میں فکرِ اقبالؔ کے تمام پہلوؤں کا عکس نمایاں ہے۔ یہ مثنوی اقبالؔ نے ۱۹۳۶ء میں شائع کی تھی اس مثنوی کے حرفِ آغاز کے طور پر انہوں نے پڑھنے والے کے نام جو چند اشعار لکھے ہیں، اس میں انسانیت کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ وہ غلبۂ فکر سے آزاد ہو کر ایک دفعہ اپنے عشق و جنوں کی قوتوں سے بھی انقلاب پیدا کرے۔ اس میں نری عقلیت پسندی کی مذمت کی ہے اور یہ تلقین کی ہے کہ عقل کو مقاصدِ عشق و ایمان کے حصول کے لئے آلہ کار بنانا چاہیئے نہ کہ فرد خود عقل کی لغاوتوں کا شکار ہو جائے۔ اس تمہید سے یہ طلسمی رمز کھلتا ہے کہ اقبالؔ اقوامِ مشرق کو اُن بے پناہ قوتوں سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، جو اُن کی روحانی شخصیتوں میں پنہاں اور جو اقوامِ مشرق کا حقیقی سرمایہ ہے۔

مثنوی کا اسلوب ڈرامائی ہے جس کے آغاز میں اقبالؔ اپنے مرشد پیر رومیؒ کی زبانی مغربیت کے بارے میں ایک اہم تلقین پیش کرتے ہیں جس میں مغرب کے مزاج کی معروضیت مادہ پرستی، خدا بیزاری پر تنقید کے علاوہ اس کے مقابلے میں خدا پرستی اور دروں بینی کی تلقین کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب نے ارضیت کی شدت سے اپنے آپ کو مذہبی تصوریت اور مذہبی حسیّت سے جدا کر لیا ہے۔ اس کے نتیجے میں بین الاقوامی سیاست میں جو نئی سیاست کاری اُبھری، اُسے اقبالؔ نے "حکمتِ فرعونی" کا نام دیا۔ یہ ایک محض اخلاقی محاسبہ نہیں۔ اسی زمانے میں لینن کی شہرۂ آفاق کتاب "سامراجیت یعنی سرمایہ داری کی انتہائی منزل" شائع ہو چکی تھی۔ مارکس اور اس کے بعد لینن کی بین الاقوامی سیاست پر تنقیدیں اپنے وقت کی بہترین فکر کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اقبالؔ کا اُن سے متاثر ہونا ضروری تھا

جس طرح اقبالؔ نے ابتداً اشتراکی کلیت پسند ریاست کے علی الرّغم اسلامی کلیت پسند مملکت کا تصوّر پیش کیا تھا اسی طرح بین الاقوامی سیاسی کردار پر بھی انھوں نے اپنی تنقید پیش کی تھی اور مغربی سامراجیت کی نجس سیاست کاری کے مقابلے میں انھوں نے ایک صحت مند سیاسی کردار کا تصوّر پیش کیا ہے جو عشق و مستی سے عبارت ہے اور خوف و فریب سے آزاد۔ اس طرح اقبالؔ نے "حکمتِ کلیمی" کے تصوّر کے ذریعے اقوامِ مشرق کو سامراجیت کے خلاف زبردست پیمانے پر برانگیخت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مرحلے میں اقبالؔ اشتراکیت کو انسانیت کے استخلاص کا اوّلین مرحلہ سمجھتے ہیں، کیونکہ اشتراکیت نے نظامِ کہنہ کو درہم و برہم کیا اور اس کے ضمیر سے انسانیت مقامِ لا تک پہونچی۔ اشتراکیت بعض ایسے امراض جیسے: سامراجیت، سرمایہ داری، کلیسائیت، شہنشاہیت اور بین الاقوامی استحصال کا فوری اور مؤثر علاج تھی تاہم اُن کے خیال میں اشتراکیت انسانیت کے سارے مسائل کا آخری علاج نہیں تھی۔ مارکس نے اشتراکیت کے ذریعے معاشرے کو مطلق تصوّریت کی فضا عطا کی، جبکہ اقبالؔ اُسے اسلامی تصوّریت کی طرف لیجانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اقبالؔ نے اقوامِ مشرق کو، مادیت کی بجائے اخلاقی اور روحانی اقدار کی بنیادوں پر اُکسایا، جس کے لئے اُنھوں نے اپنا خاص تصوّر "فقر" پیش کیا۔ اُنھوں نے ذاتِ مصطفویؐ میں فقر و شاہی کا جو غیر معمولی امتزاج دیکھا وہ اُسے سماجی قوانین کی اساس بنانا چاہتے تھے۔ اسی لئے اقبالؔ نے شریعت کو زندگی کے بہترین تشکیلی قانون سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کے خیال میں کسی بھی شریعت کو اندھا دھند مان لینا خشک اور بے مغز عمل ہے۔ کردارِ مصطفویؐ میں فقر و شاہی کو یکجا دیکھنے سے جو نظر پیدا ہوتی ہے وہی کشودِ کار کی ضامن ہے اور یہی طریقت ہے۔

اقبالؔ اس کے بعد ہندوستانیوں کے افتراق پر آنسو بہاتے ہیں اور

انُ کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو انگریزوں کی نفاق انگیزی سے محفوظ رکھیں یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں نے اپنے نظم ونسق، عدلیہ، نظامِ تعلیم وغیرہ سے ہندوستانیوں کو ایک احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں کو بہترین حکمران سمجھتے تھے جو ایک شرم ناک تصور تھا۔ اقبالؔ نے اپنی نظم "سیاسیاتِ حاضرہ" کے ذریعے اس رجحان پر شدید تنقید کی ہے اور ہندوستانیوں کو آگاہ کیا ہے کہ وہ اِس فریب سے نکلیں اور اس وقت تک سرگرمِ جدوجہد رہیں جب تک وہ اپنی عیدِ آزادی نہ منالیں۔

اقبالؔ خوب جانتے تھے کہ ایشیا میں تنہا ہندوستانیوں کی آزادی زیادہ معنی خیز نہیں ہوسکتی جب تک پورا ایشیا بیدار نہ ہو۔ اس لئے انہوں نے عرب اقوام سے خاص اپیل کی کہ وہ سامراجی سیاست سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور آنے والی نسلوں کو اس کے خطرناک اثرات سے بچائیں۔

مثنوی کے آخر میں اقبالؔ تمام اقوامِ مشرق کو مخاطب کرتے ہیں کہ اگر وہ یورپ اور انگریز کی تاجرانہ سیاست کاری کے فریب کو نہ سمجھیں تو مشرق میں کبھی روشنی نہیں ہوسکتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایشیا صنعتی اور سائینسی ترقی سے بڑی حد تک محروم تھا اور یورپ کی ترقی سے آنکھیں چکاچوند ہورہی تھیں۔ اقبالؔ پوری تہذیب کی قدر و منزلت سے خوب واقف تھے، لیکن اس کے مکروہ پہلوؤں سے اقوامِ مشرق کو متنبہ کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے اس کے باوجود انھیں مغرب کی "شکر فروشی" کے مقابل مشرق کی "طفلانہ" طبیعت سے بڑا خدشہ تھا۔

اقبالؔ نے یہ مثنوی ایک نہایت دلکش اور پُر سوز نظم پر ختم کی ہے جو حضورِ رسالت مآبؐ میں ان کی "عرض" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ نے پوری مثنوی کے تاثر کو انتہائی مرتکز کر کے پیش کیا ہے اور بارگاہِ رسالتؐ میں پہونچنے کی تمنا ظاہر کی ہے۔

(۵)

اقبالؔ کے افکار نظم و نثر دونوں میں موجود ہیں۔ اُن کی شاعری کے حسن اور عظمت کا اعتراف ڈاکٹر محمد نقی بہارؔ، علی اصغر حکمتؔ، سعید نفیسی اور احمد سروش جیسے بلند پایہ ایرانی ناقدین نے کیا ہے۔ اُن کی فارسی گوئی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایشیا کی مختلف اقوام تک ان کا پیام پہونچے۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ فارسی جہاں اُردو سے انتہائی قریبی زبان ہے وہیں فارسی سے اردو میں ترجمے کا کام، دنیا کی کسی اور زبان سے اُردو میں ترجمے کے کام سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ہماری نئی نسلیں فارسی سے بے بہرہ ہیں باوجودیکہ رسم الخط دونوں زبانوں کا ایک ہی ہے۔ اقبالؔ کے ایسے بہت سے شیدائی ہیں جو کثرت سے ان کی اُردو شاعری پڑھتے ہیں اور اس بات پر افسردہ رہتے ہیں کہ وہ اقبالؔ کی فارسی شاعری سمجھنے سے قاصر ہیں۔ میرے دوست مضطرؔ مجاز نے جو کم و بیش گزشتہ بیس سال سے اقبالؔ کی اردو اور فارسی شاعری کے مطالعے میں غرق ہیں، اقبالؔ کی فارسی شاعری اور اردو شاعری کے قریبی رابطے سے اس امکان کا پتہ لگایا کہ اقبالؔ کی فارسی شاعری کا اقتباساتی اُردو میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے چنانچہ انھوں نے اقبالؔ کی ان تمام رُباعیات کا جو "ارمغانِ مجاز" کے فارسی حصے میں شامل ہیں اور اقبالؔ کی بیشتر فارسی نظموں کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں مضطرؔ مجاز کو جو نظر حاصل ہے اسکی وجہ سے وہ اس قابل ہیں کہ اقبالؔ کے کسی فارسی شعر کو اُردو میں اقبالی انداز کی ایسی نظم کہہ ڈالیں جو اس شعر کی مکمل ترجمانی ہو، لیکن اس سے ان لوگوں کی ضرورت کی تکمیل نہیں ہوسکتی جو اقبالؔ سے قریبی اکتساب کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اسی ضرورت کے پیشِ نظر مثنوی "پس چہ باید کرد" کے ہر شعر کا انھوں نے اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لفظاً و معناً اصل فارسی شعر سے قریب تر ہو۔ جو لوگ فارسی متن کے ساتھ اس ترجمے کو پڑھیں گے وہ نہ صرف ترجمے کے بہت سے محاسن سے لطف اٹھانے کے قابل ہوں گے بلکہ اس سے

اصل فارسی شعر کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

مضطر مجاز نے ترجمے میں تخلیق سے زیادہ اصولِ ترجمے ہی کو ملحوظ رکھا ہے۔ ترجمے کی اس متقیانہ کوشش میں انھوں نے اس اقتضائے شعری سے بھی صرفِ نظر کیا ہے جو ترجمے کے لسانی پیکر سے خودبخود پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے لئے ان سے کسی حد تک شکایت کی جا سکتی ہے، لیکن اس ترجمے کا بیشتر حصہ تخلیقی تازگی سے شاداب ہے۔ یقین ہے کہ یہ منظوم ترجمہ اردو داں طبقے کے لئے اقبال فہمی کا ایک مؤثر وسیلہ ثابت ہوگا اور اقبالیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ بھی۔

اُمید ہے کہ مضطر مجاز نے اقبال کی دوسری مثنویوں، نظموں اور رباعیوں کے جو اُردو ترجمے کئے ہیں، وہ بھی رفتہ رفتہ اسی طرح منظرِ عام پر آجائیں گے۔ ... ... ••

تعارفِ مترجم:

اصلی نام: سیّد غلام حسین رضوی

پیدائش و مقام: ۱۳ر فروری ۱۹۳۵ء۔ حیدرآباد

تعلیم: بی۔ کام (عثمانیہ)

اس کتاب کے قاری سے

(اقبال)

حرم میں ڈر ہے، بغاوت خرد نہ کر ڈالے
اٹھا ہوں عشق کی اک فوجِ تازہ دم لیکر
زمانہ اس کی حقیقت سمجھ نہیں پایا
قبا، جنوں کی ہے موزوں خرد کی قامت پر
خرد کو غلبۂ سعادت ہے، وہ ہے میرا مقام
کرے وہ میرے در و بام کا طواف اگر
خرد نہیں ہے مبرّا حساب و میزاں سے
نگاہِ بندۂ مومن ترازوئے محشر

(ترجمہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مناجات

(جاوید نامہ)

اس جہانِ رنگ و بو، میں آدمی
مثلِ نَے گرمِ فغاں ہے ہر گھڑی
آرزوئے ہم نفس اسکو جلائے
نالہ ہائے دل نواز اسکو سکھائے
آہ! یہ عالم کہ ہے بس آب و گِل
کس طرح کہئے کہ ہے دارائے دل
بحر و دشت و کوہ و کہہ خاموش ہیں
آسمان و مہر و مہ خاموش ہیں
تو ہے تاروں کا فلک پر کارواں
ہے مگر ہر ایک تنہا تر وہاں!
سب ہماری طرح سے بے چارہ ہیں
اس فضا میں سر بہ سر آوارہ ہیں
کارواں بے گانۂ برگِ سفر
بیگراں افلاک ہیں، شب سُست تر
یہہ جہاں ہے صید اور صیّاد ہم
یا اسیرِ رفتہ ہیں اے یاد! ہم

رو رہا ہوں میرا محرم ہے کہاں
ہم نفس فرزندِ آدم ہے کہاں

آہ یہہ روزِ جہانِ چار سو !
ہیں درخشاں جس سے سارے کاخ و کو

ہے رمِ سیّارہ سے اس کا وجود
کچھ نہیں ہے یہہ بہ جز اک رفت و بود

ہائے وہ دن جو نہیں ایّام سے
صبح بیگانہ ہے جس کی شام سے

پھیل جائے گر اب اسکی روشنی
مثلِ رنگ آئے نظر آواز بھی !

غیب بھی ہو جس کی تابش سے حضور
تو بت اسکی لازوال و بے مرور

اے خدا وہ دن عطا کر دے مجھے
اِس اسیری سے رہا کر دے مجھے

کس کے حق میں آیۂ تسخیر ہے؟
کس کا حیراں یہ سپہرِ پیر ہے؟

رازدانِ عَلَّمَ الْاَسْمَا ہے کون؟
مست اس ساقی و صہبا کا ہے کون؟

برگزیدہ از ہمہ عالم ہے کون؟
سرِ ہست و بود سے محرم ہے کون؟

تیر کو تیرے ہدف سینہ مرا
حرفِ اُدْعُوْنِیْ کہا کِس سے گیا؟

رخ تیرا، ایماں مرا، قرآں مرا
جلوہ اپنا میری جاں سے مت چھپا

جب نکلتی ہے شعاعِ آفتاب
کم نہیں ہوتی متاعِ آفتاب

عصرِ حاضر کو خرد زنجیر پا
جانِ مضطر سے ہیں سب ناآشنا

سینکڑوں جب پیچ کھائے کائنات
جانِ مضطر تب کہیں آتی ہے ہات!

آہ لیکن یہہ زمینِ شورہ زار
کب ہے تخمِ آرزو کو سازگار!

سر بسر ہے سخت و بے حاصل یہہ گِل
بس غنیمت ہے اگر پیدا ہو دِل

میرے مہہ! میرے شبستاں سے گذر
کر میری بے نوریِ جاں پر نظر!

شعلہ کے نزدیک ہے خاشاک کیا
برق کو ہو ٹوٹنے سے باک کیا

تا بکے سہتا رہوں دردِ فراق!
راہ دکھلا دے سوئے نیلی رواق

بند جو در ہیں وہ مجھ پر باز کر
قدسیوں کا اب مجھے ہمراز کر

آگ وہ پھر میرے سینہ میں لگا
عوْد کو چھوڑ اور ہیزم کو جلا

رکھ پھر اُس آتش پہ میرے عوْد کو
دہر میں پھیلا دے میرے دوْد کو

آتش پیمانہ میری تیز کر
بے رخی کو التفات آمیز کر

میں تیرا جوْیا ہوں تو مجھ سے ہے دوْر
توبہ توبہ! آنکھ ہی ہے میری کوْر!

یا، اٹھا اس پردۂ اسرار کو
چھین لے، یا جانِ بے دیدار کو

نخل میری فکر کا بے برگ و بر
یا تبر ہی بھیج، یا بادِ سحر

عقل دی ہے تو جنوں بھی دے مجھے
اور جذبِ اندرون بھی دے مجھے

علم کرتا ہے گمانوں میں مقام
عشق کا کاشانہ قلبِ لاینام

علم جب تک عشق سے بیزار ہے
اک تماشہ خانۂ افکار ہے

نام اس شے کا ہے سحر سامری
علم بے روح القدس افسوں گری

بے تجلّی زندگی رنجور ہے
عقل ہے مہجورِ دیں مجبور ہے

بے تجلّی راستہ ہے اک شراب
یعنی مر جانا ہے اپنی موت آپ

یہ جہانِ کوہ و دشت و بحر و بر
ہے "نظر" سے دور دیتا ہے "خبر"

کر عطا منزل دلِ آوارہ کو
کر عنایت ماہ اس مہ پارہ کو

گرچہ ہوں میں ہر گھڑی محوِ کلام
قصۂ فرقت نہیں ہوتا تمام

زیرِ گردوں خود کو پاتا ہوں غریب
ہو مخاطب مجھ سے، کہہ اِنّی قریب!

تاکہ مثلِ ماہ ہو جائیں غروب
یہہ جہات اور یہہ شمال اور یہہ جنوب

یہہ طلسمِ دوش و فردا ٹوٹ جائے
دور یہہ اوجِ ثریّا چھوٹ جائے

تو
تو فروغِ جاوداں ہے میں شرار
ایک دم رکھتا ہوں سو بھی مستعار

تو نزاعِ مرگ و ہستی سے ہے دور
رشک ہے یزداں پہ بندہ کو ضرور!

بندۂ آفاق گیر و نا صبور
تے غیاب! اسکو خوش آئے نہ حضور

میں ہوں آنی، جاودانی کر مجھے
ہوں زمینی، آسمانی کر مجھے

منضبط گفتار اور کردار دے
راستہ معلوم ہے، رفتار دے

اک نئے عالم سے ہوں محوِ خطاب
مجھ پہ اتری ہے جہاں سے یہہ کتاب

بحر ہوں اور ہے سکوں مجھ پر خطا
کون ہے میرے عمق سے آشنا

ایک عالم ہے مرا ساحل نشیں
جز رم موج اس نے کچھ دیکھا نہیں

میں کہ ہوں نومیدِ پیرانِ کہن
آنے والے دن سے رکھتا ہوں سخن

سہل کر دے نوجوانوں پر یہہ حرف
اور پایاب ان پہ کر دے میرا ژرف

پس کیا کیا چاہیئے اقوامِ شرق

تمہید

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی کا امیر

جسکی منزل مہر و مہ سے ہے بلند
ڈالتا ہے کہکشاں پر جو کمند

نورِ قرآں سے ہے روشن جس کا دل
جس کے آئینہ سے جامِ جم خجل

ہے وہ سوز اسکی نوائے پاک میں
جس سے برپا شور میری خاک میں

"محرمِ اسرار ہر جاں ہو گئی
نیند چشمِ شرق میں تھی جو گئی

جذبہ ہائے تازہ دل میں آ بسے
بند ہائے کہنہ سارے کھل گئے

جز ترے دانائے اسرارِ فرنگ
کس نے یوں گلزار کی نارِ فرنگ

رہ یونہی مثلِ خلیل اللہ مست
ہے ہر اک بتخانہ کی قسمت شکست

امتوں کی زندگی جذبِ دروں
کم نظر جس کو سمجھتے ہیں جنوں

کوئی قوم اس چرخ کے نیچے کبھی
بے جنوں کب کام کوئی کر سکی

دولتِ عزم و توکل ہے اگر
ہے وہ مومن، ورنہ کافر سر بسر

جانتا ہے وہ کہ کیا ہے خیر و شر
ہے نظر سے اس کی سب زیر و زبر

کوہ اسکی ضرب سے ہے ریزہ ریزہ
اور گریباں حاملِ صدر ستخیز

میرے مئے خانہ سے پی تو نے شراب
کہنگی سے چھین لی سب آب و تاب

زندگی کر مثل بُو، مستور و فاش
رنگ میں بے رنگیوں سے کر معاش

رمزِ جاں سے کب یہہ دہر آگاہ ہے
اسکا مذہب حُبِّ غیر اللہ ہے

فلسفی نے رمز یہہ سمجھی کہاں
فکر اسکی آب و گل میں ہے نہاں

آنکھ میں جب ہو نہ دل کی روشنی
جز کبود و سرخ کیا دیکھے کوئی

جس نے دل ہارا نہیں وہ شاد ہے
بندِ غیر اللہ سے آزاد ہے

ستر شیری اور سمجھیں گاؤ خر؟
فاش شیروں پر ہی اپنا راز کر

ساتھ کم ظرفوں کے ہرگز پی نہ مئے
گرچہ ہو وہ پادشاہِ روم و رے

بھیڑیا یوسف کو لے جائے اگر
اس سے بہتر ہے کہ لے ناکس خبر

اہلِ دنیا بے تخیل، بے قیاس
بوریا بافانِ اطلس ناشناس

کس قدر ہے خوب یہہ شعرِ عجم
ہے اثر سے جس کے سوزِ دمبدم

"نالۂ عاشق بگوشِ مردمِ دنیا
بانگِ مسلمانی و دیارِ فرنگ ست!

معنیٔ دین و سیاست فاش کر
اہلِ حق پر پھر وہ حکمت فاش کر

کھائے جا غم، بے جھجک غم کھائے جا
ہاں مگر نانِ غم افزایاں نہ کھا!!!
کیونکہ عاقل غم پہ کرتا ہے گذر سگ اور لڑکوں کی غذا شہد و شکر"

خرقہ خود دوشِ قلندر پر ہے بار
چل صبا کی طرح لے کر بوئے یار

تو اگر قلزم ہے دشت و در میں آ!
اور شبنم ہے تو بزمِ گل میں جا!

سرِّ حق کب مردِ حق سے ہے نہاں
روحِ مومن کیا ہے؟ سُن اے جانِ جاں

قطرۂ شبنم ہے یہہ اے مردِ رہ
جس نے اپنے آپ کھولی ہر گرہ!

جو رہا مصروفِ تعمیرِ خودی
ہر زماں، ہر آن، ہر دم، ہر گھڑی

نے سوئے دریائے بے پایاں گیا
نے صدف میں جا کے پوشیدہ ہوا

تپ کے آغوشِ سحر میں یک دو دم
ہو گیا غنچہ سے آخر کو بہم!

خطاب بہ مہرِ عالم تاب

اے امیرِ خاور! اے مہرِ منیر!
تو نے ہر شئے کو کیا روشن ضمیر!

تجھ سے ہی سوز و سرور و جستجو
تجھ سے ہر اک شئے میں ہے ذوقِ نمو

ہے یدِ بیضا سے روشن تر ہر آں
تیری کشتی جوئے یمیں میں رواں

تیرے پرتو سے ہے روشن ماہتاب
تو نے پتھر کو بنایا لعلِ ناب

لالہ میں سوزِ دروں بھی تجھ سے ہے
اسکی رگ میں موجِ خوں بھی تجھ سے ہے

چاک نرگس نے کئے پردے ہزار
پائی تب تیری شعاعِ تاب دار

لے کے تو اک صبح روشن آ گیا
ہر شجر کو نخلِ سینا کر دیا!!

تو، فروغِ صبح، میں شامِ فراغ
کر مرے دل میں فروزاں اک چراغ

خاک کو میری سراپا نور کر
اپنے جلوؤں میں مجھے مستور کر

تا کہ کر دوں شامِ مشرق کو سحر
سینۂ احرار کو تابندہ تر!

پختہ تر کر تا چلوں ہر گام کو
ذوقِ نو دوں گردشِ ایام کو

فکرِ مشرق ہو نہ مجذوبِ فرنگ
پائے نغموں سے مرے وہ آبِ رنگ

ذکر کی گرمی سے ہے یہ زندگی
فکر کی پاکی کا نام آزادگی!

قوم کی جب فکر ہوتی ہے خراب
ہاتھ میں اسکے ہے مٹی سیم ناب

مرگیا سینہ میں جب قلبِ سلیم
کج ہے پھر اسکی نظر میں مستقیم

جب نہ دیکھے آنکھ رزمِ کائنات
ڈھونڈتی ہے پھر سکوں ہی میں حیات

موج اُسکے بحر میں اٹھتی نہیں
گوہر اُس کا ایک کنکر بھی نہیں

پہلے لازم ہے کہ ہو تطہیرِ فکر
بعد ازاں مشکل نہیں تعمیرِ فکر

حکمتِ کلیمی

جب نبیؐ نے حکمِ حق جاری کیا
لرزہ حکمِ شاہ پر طاری کیا

قصرِ شہہ اُسکے لئے اک کہنہ دیر
غیرت اس کی اور مانے حکمِ غیر؟

اسکی صحبت پختہ کر دے خام کو
اک نیا ہی رنگ دے ایام کو

اُس کا درس اللہ بس، باقی ہوس
مردِ حق اور ہوا سیرِ بندرکس؟

اُسکے نم سے دے اُٹھے لو شاخِ تاک
اُسکے دم سے جی اُٹھے اک مشتِ خاک

معنیِ جبریل و قرآں ہے وہی
فطرتِ حق کا نگہباں ہے وہی

اسکی حکمت عقل سے ہے ماورا
اُسکے دل سے ایک امت ہو بپا!

حکمراں ہے بے نیاز تخت و تاج
بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

دَے سے بھی پیدا کرے وہ فرد دیں
تلخ تر ہوئے سے بھی دُردِ حسیں

اُسکی آہِ صبحگہہ میں ہے حیات
تازہ دم اسکی سحر سے کائنات

بحر و بر ہیں اسکے طوفاں سے خراب
ہے نگہہ اسکی پیام انقلاب

درس لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ کا دیا
سینۂ آدم میں دل اُس نے رکھا

عزم و تسلیم و رضا اسکو سکھائے
دہر میں مثلِ چراغ اسکو جلائے

کیا خبر کیسا فسوں کرتا ہے وہ
رُوح میں اک ولولہ بھرتا ہے وہ

اسکی صحبت ہر خزف کو دُر کرے
اُسکی حکمت ہر تہی کو پُر کرے

بندۂ درماندہ سے کہتا ہے "خیز"
ہر کہن معبود کو کر ریز ریز!!!!

مردِ حق! اس کہنہ بت خانہ کو چھوڑ
ربی الاعلیٰ سے اسکا سحر توڑ!!!

چاہتا ہے فقر تو بن اہل حال!
عافیت تجکو نہ دیں گے جاہ و مال

تنگدستی کا گلہ شکوہ نہ کر
تا بکے آخر تلاشِ سیم و زر!

صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد ؟ ان سے دل معمور کر اے زندہ مرد!
تا بکے کاؤس و کے کی بندگی
کر طواف اپنی خودی کا ہر گھڑی

اپنی منزل سے تو دور افتادہ ہے
کرگسی کم کر کہ شاہین زادہ ہے

کرتا ہے تعمیر مرغِ بوستاں
اپنی مرضی کے مطابق آشیاں

تو کہ تیری فکر ہے گردوں مسیر
خود کو تو ہرگز نہ جان اُس سے حقیر

اک نیا ہی آسماں تعمیر کر!!
اپنی مرضی پہ جہاں تعمیر کر!!

جب فنا بہرِ رضائے حق ہوئی
ہستیِ مومن قضائے حق ہوئی

اسکے قلب پاک سے با صد چشم
جنم لیتا ہے جہان کیف و کم

ہو رضائے حق میں گم مثلِ سلف
اپنے گوہر کو نہ رکھ زیبِ صدف

ظلمت آبادِ جہاں میں اے ندیم!
کام میں لا دیدۂ طبعِ سلیم!

گر نہ مانگے گا جلالِ حق سے تو
کچھ نہ پائے گا جمالِ حق سے تو

ابتدائے عشق و مستی قاہری
انتہائے عشق و مستی دلبری

مردِ مومن ہے سراپا اک وجود
ماسوا کیا ہے، فقط نام و نمود

جس نے پایا لَا اِلٰہ سے سوز و تاب
ہیں غلام اس کے یہہ ماہ و آفتاب

حکمت فرعونی

کہہ چکا ہوں حکمتِ اربابِ دیں
مجھ سے سُن اب حکمتِ اربابِ کیں

حکمتِ اربابِ کیں ہے مکر و فن
مکر و فن؟ تخریبِ جاں تعمیرِ تن

بندِ دیں سے ہے جو بیزار و نفور
ہے مقامِ شوق سے جو دور دور

الاماں! یہہ اسکے مکتب کا نظام
ہیں غلامِ خواجہ افکارِ غلام

اُسکی مرضی کے مطابق شیخ دیں
ڈھالتا ہے حکمتِ دینِ مبیں

اسکے دم سے وحدتِ ملّت دونیم
ہے حریفِ اسکی فقط چوبِ کلیم

ہے وہ ملّت کشتۂ تدبیرِ غیر
محو تخریبِ خود و تعمیرِ غیر

علم و فن میں گرچہ ہے صاحب نظر
اپنی ہستی سے ہے لیکن بے خبر

دھو دیا اپنے نگیں سے نقشِ حق
ہوگیا ہر آرزو کا سینہ شق

قوم وہ خُردم اولادِ غیور
زندگی سے ہے جو بیزار و نفور

بے حیا سب، اسکے پیرانِ کہن
نوجواں بننے سنورنے میں مگن

آرزوئیں دل میں ہیں پر بے ثبات
موت سے بھی ہے بتر اُن کی حیات

لڑکیاں خود زلف میں اپنی اسیر
شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر

ساختہ، پرداختہ، دل باختہ
اور ابرو مثلِ تیغ آختہ
بن سنور کر دل کہیں ہاری ہوئی کہ شوقِ خود آرائی کی ماری ہوئی

حُسن ان کا الاماں و الحذر
دوسروں کے واسطے عیشِ نظر

ملّت اک ہے خاک جس کی بے شرر
صبح جس کی شام سے تاریک تر

ہر گھڑی محوِ تلاشِ ساز و برگ
ہر گھڑی فکرِ معاش و ترسِ مرگ

اہلِ دولت سب بخیل و عیش دوست
حق سے غافل اسیرِ بندِ پوست

قوّتِ فرمانروا اُس کا خدا!
ہے زیانِ دیں میں اُس کا فائدا

اُس نے جُز امروز کچھ دیکھا نہیں
اُس کی قسمت میں کوئی فردا نہیں

علم کو رکھتے ہیں لیکن الاماں!
بے عمل ہیں اُسکے سب پیر و جواں!

دین ہے اسکا اطاعت غیر کی
خشتِ کعبہ اور عمارت دیر کی

مر چکی وہ قوم حق سے ٹوٹ کر
لیکن اپنی موت سے ہے بے خبر!

لا اِلٰہ اِلّا اللہ

کہہ گئے ہیں مجھ سے یہ مردانِ حال
اُمتوں کو لا جلال، الّا جمال

لا و اِلّا احتساب کائنات
لا و اِلّا فتحِ باب کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نوں
لا سے حرکت زاید، اِلّا سے سکوں

جس کو رمزِ لا اِلٰہ آجائے ہاتھ
بندِ غیر اللہ سے پائے نجات

حرفِ لا سے ہے جہاں کی ابتدا
ہے یہ پہلی منزلِ مردِ خدا

ملّت اس کے سوز سے جو تپ اٹھی
پائے اپنی خاک سے اک زندگی!

پیشِ غیر اللہ ہے لا کہنا حیات
اسکے ہنگامہ سے تازہ کائنات

اُس سے کب ہر اک گریباں چاک ہے؟
کب یہ شعلہ لائقِ ہر اک خاک ہے؟

جذبہ سے اسکے فقط اک زندہ مرد
رہ نشینوں کو بنائے رہ نورد!

گر ستیز آرا ہو بندہ خواجہ سے
تخم لا مٹی میں اسکی ڈال دے!

سوز یہ جس کے جگر میں بس گیا
ہول اس کا ہولِ محشر سے سوا

لا مقامِ ضرب ہائے پئے بہ پئے
ہے کڑک بجلی کی نے آواز نے

ضرب! اسکی بود کو کر دے نبود
تار ہے باقی نہ گردابِ وجود

تجھ سے کہتا ہوں عرب کی داستاں
پختہ و خام اس کا سُن اے جانِ جاں

ضرب سے اسکی گرے لات و منات
ہے جہاں میں رہ کے آزادِ جہات

ہر قبائے کہنہ اس سے چاک چاک
قیصرو کے ہاتھ سے اسکے ہلاک

دشت اسکے برق و باراں سے تباہ
بحر اس کے زورِ طوفاں سے تباہ!

عالم اسکی آگ میں ہے مثلِ خس
یہ فقط ہنگامۂ لا ہے و بس!

پیہم اس دیر کہن میں تپ چکا
تب جہانِ تازہ اک ظاہر ہوا

بانگِ حق اسکی سحر خیزی سے ہے
جو بھی ہے اسکی سمن ریزی سے ہے

آج جو روشن یہ شمعِ لالہ ہے
یہ اُسی کے باغ کی آوردہ ہے

نقشِ غیراللہ دل سے دھو دیا
خاک سے اسکی ہوا محشر بپا

دیکھ تو بھی یہ تماشائے فرنگ
خواجگی سے بندہ ہے مصروفِ جنگ

روس نے قلب و جگر جب خون کیا
اسکے دل سے حرفِ لا ظاہر ہوا

اُس نظامِ کہنہ کو برہم کیا
اور رگِ عالم پر اک نشتر رکھا

کی ہے میں نے فکر میں اُسکی نگاہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا اِلٰہ

وادیِ لا میں بھٹک کر رہ گئی
جانبِ اِلّا نہ لیکن جا سکی

آئے گا وہ دن جنوں کے زور سے
وادیِ لا سے نکل آئے گا یہ!

لا میں آسائش نہیں باقی حیات
سوئے اِلّا بڑھ رہی ہے کائنات

لا و الّا اُمتوں کا ساز و برگ
نفیِ بے اثبات میں ہے اُن کی مرگ

پختہ کیونکر ہو محبت میں خلیلؑ
گر نہ لائے لا سوئے الّا دلیل

اسے کہ حجرہ میں ہے تو بیٹھا ہوا
نعرہ یہ نمرود کے آگے لگا

اس جہانِ کہنہ کی قیمت ہے کیا
ہو جلالِ لا اِلٰہ سے آشنا

جس کے قبضہ میں ہے یہ شمشیر لا
ہے وہ موجودات کا فرماں روا!

فقر

کیا ہے فقر اے بندگانِ آب و گل
اک نگاہِ راہ بیں، اک زندہ دل

فقر اپنے کام کو پہچاننا!
سوز و سازِ لا اِلٰہ کو جاننا

فاتحِ خیبر ہے وہ کہا کر شعیر
ہیں اسیر اسکے شہ و میر و وزیر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا
یہ امانت ہے متاعِ مصطفٰےؐ

فقر کی زد میں ہیں یہ کرّ و بیاں
فقر کی زد میں نوامیسِ جہاں

بخشتا ہے اک نیا تجکو مقام
شیشہ سے تجکو کرے الماس فام

برگ و ساز اس کا ہے قرآنِ عظیم
مردِ درویش اور مرہونِ کلیم ؟

انجمن میں گرچہ ہے وہ کم سخن
ایک دم اس کا گرمیِ صد انجمن

بے پروں کو ذوقِ پرواز اُس نے دی
پشہ کو تمکینِ شہباز اس نے دی

ہے ستیز آرا سلاطیں سے فقیر
بوریئے سے اسکے لرزاں ہے سریر

نعرۂ یا ھو سے وہ دم میں کرے
خلق کو آزاد جبر و قہر سے!

صرف اس صحرا میں کرتا ہے مقام
جس میں شاہیں سے الجھتا ہو ہمام

قوت اسکے قلب کی جذب و سلوک
پیش سلطاں نعرہ اس کا لا ملوک

ہم میں سوز و ساز اسکی خاک سے
شعلہ سرد اسکی خس و خاشاک سے

کون اُس ملّت سے بازی لے سکا
جس میں اک درویش بھی باقی رہا

اسکا استغنا، ہماری آبرو
شوق اسکا، اپنا سوزِ جستجو

دیکھ اُس آئینہ میں خود کو کہیں
تاکہ بخشیں تجھکو سلطانِ مبیںؐ

حکمتِ دیں دل نوازی ہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

مومنوں سے کہہ گئے ہیں شاہِ دیںؐ
میری مسجد ہے یہ سب روئے زمیں

مسجدِ مومن، یہ کیا ہے ماجرا
قبضۂ اغیار میں؟ صلِّ علےٰ!

سخت کوش و تند و بے وسواس ہو
تا کہ مسجد تیری تیرے پاس ہو!

کس لئے ترکِ جہاں کا سلسلہ ؟
مومن اور ترکِ جہاں ؟ صلِّ علےٰ

تو سمجھتا ہے جسے ترکِ جہاں
ہے وہ تسخیرِ جہاں اے جانِ جاں

اس کا راکب بن کے ہو اُس سے رہا
اس مقامِ آب و گل سے ہو جُدا

صید یہہ تیرا ہے منھ اس سے نہ موڑ
باز سے کہتا ہے اپنا صید چھوڑ!

مجھ سے حل ہوتا نہیں یہہ مسئلہ
کس لئے افلاک سے شاہیں پھرا

ہائے جس شاہیں نے شاہینی نہ کی
جس کے چنگل میں نہیں اک طیر بھی

رہ گیا جو آشیاں میں سرنگوں
اور نہ کی سیرِ فضائے نیلگوں!

فقرِ قرآں احتساب ہست و بود
نے رباب و مستی و رقص و سرود

فقرِ مومن کیا ہے؟ تسخیرِ جہات
بندہ جس کے فیض سے مولا صفات

فقرِ کافر کیا ہے؟ کنجِ دشت و در
فقرِ مومن لرزۂ صد بحر و بر

زندگی اسکی سکون غار و کوہ
زندگی اسکی ہے مرگِ باشکوہ

ہے تلاشِ حق وہاں ترکِ بدن
اور جلا دینا خودی کو بے کفن

اور یہاں کرنا اُسے تیز و رواں
روشن و برّاق و رخشاں شمع ساں!

فقر جب عریاں ہوا زیرِ سپہر
اسکی ہیبت سے ہوں لرزاں ماہ و مہر

فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حنین!
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ

فقر سے جب ذوقِ عریانی گیا
پھر وہ جبروتِ مسلمانی گیا

وائے ہم! اے وائے یہ بزمِ فنا
تیرے قبضہ میں نہ میرے تیغِ لا

رشتہ غیر اللہ سے توڑ اے جواں
اس جہانِ کہنہ کو چھوڑ اے جواں

کب تلک بے دیں رہے گی زندگی
موت سے بدتر ہے ایسی زندگی

مردِ حق دیتا ہے خود کو اک حیات
دیکھتا ہے نورِ حق سے اپنی ذات

بر عیارِ مصطفیٰؐ خود کو رکھے
تاکہ پیدا اک جہانِ نو کرے

کس مپرسی آہ یہ اُس قوم کی
جس میں پیدا ہو نہ اک درویش بھی

کیا کہوں اس قوم کی میں داستاں
مجھ سے ہو سکتا نہیں اسکا بیاں

ہو کے اشک آلود رہ جاتا ہوں میں
اک قیامت دل پہ سہہ جاتا ہوں میں

ایک مدت سے یہاں اے ہم نشیں
کوئی مردِ باخدا پیدا نہیں

قوتِ دیں سے ہے اسکو سوئے ظن
ہے خود اپنے کارواں کا راہزن

تین صدیوں سے یہہ امت الاماں
زندہ ہے افسوس! بے سوزِ نہاں

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق
مکتب و ملا سبھی محروم شوق

زشتیٔ اندیشہ سے وہ خوار ہے
چھوٹ سے آپس کی خود بیزار ہے

اپنی منزل کی نہیں اسکو خبر
"الامان والحفیظ و الحذر!"

مر چکا ہے دل میں ذوقِ انقلاب
"ہو چکا ہے دل سے رخصت سوز و تاب"

ایک بھی جس میں نہیں مرد خبیر
خستہ و افسردہ و حق ناپذیر

بندۂ رد کردۂ مولا ہے وہ
مفلس و قلاش و بے پروا ہے وہ

مال کیسہ میں نہ سینہ میں ہے نور
ہیں شہ و ابلیس سب اس سے نفور

شیخ ہے مردِ فرنگی کا مرید!
گرچہ ہے لب پر کلامِ بایزیدؒ

رونق دیں اس کو محکومی کا نام
ہے، خودی سے 'زیست' محرومی کا نام

دولتِ اغیار کو رحمت کہا
گھوم کر گردِ کلیسا مر گیا!

☆

اے کہ ذوق و شوق سے ہے تو تہی!
اے کہ دردو ذوق سے ہے تو تہی!

تجکو ہے معلوم اے مردِ خدا
عصرِ حاضر نے کیا ہے ہم سے کیا

اس نے ہم کو، ہم سے بیگانہ کیا
سرورِ عالمؐ سے بیگانہ کیا

سوز اُس کا ہو گیا سینہ سے گُم
جوہر آئینہ، آئینہ سے گُم

باطنِ حاضر نہ پہچانا کبھی !
دائومیں پہلے ہی ہستی ہار دی

جب تری عقل اسکے چکّر میں پھنسی
آرزوئے زندہ دل میں مرگئی !

احتساب اپنا بھی کرتا رہ ضرور
پل دو پل کو غیرِ خود سے بھی ہو دُور

تا بہ کے یہ خوف و وسواس و ہراس
یعنی اس کشور میں بن تو خود شناس

ان گنت اونچی بھی شاخیں ہیں یہاں
مت بنا شاخِ نگوں پر آشیاں

نغمہ ہے تیرے گلو میں بے خبر
ہمرہِ زاغ وزغن آہیں نہ بھر!

آپ کو پھر تیزیِ شمشیر دے
خود کو پھر ہاتھوں میں دے تقدیر کے

بحر میں پوشیدہ ہے سیلِ بے پناہ
جس کو ہے کوہِ گراں بھی مثلِ کاہ

سیلِ کُو آسودگی سے کام کیا
وہ تو ہے پروانہ اس کو موت کا

میں نہ مُلّا، نے فقیہہ نکتہ ور
فقر و درویشی سے کیا مجکو خبر

راہِ دیں میں تیز بیں و سست گام
کام میرا خام ہے اور نا تمام

مجھ کو بخشا ہے دلِ پُر اضطراب
سو گرہ سے اک گرہ کھولی شتاب

دیکھتا ہوں تیری قسمت کی لکیر
مجھ سا آئے گا نہ پھر مردِ فقیر!

مردِ حُر

مردِ حُر مصروفِ وردِ لا تخف
سر بہ جیب آتے ہیں ہم، وہ سر بکف

لا الہ سے وہ سدا روشن ضمیر
مردِ حُر اور بندۂ سلطان و میر؟

مثلِ اشتر مردِ حُر ہے سخت کوش
بے نیازِ فکرِ خواب و خورد و نوش

پاؤں یوں رکھتا ہے وہ مردِ جواں
نبضِ رہ ہے سوز سے جس کے تپاں

اُسکی ہستی پختہ تر ہے موت سے
بے نیاز اس کی ندا ہے صوت سے

سنگِ رہ کو جو سمجھتا ہے زجاج!
شہ سے وہ درویش لیتا ہے خراج

اسکی صہبا سے ہیں تجھ میں گرمیاں
فیض اسی کا ہے تری جوئے رواں

میروشہ با صد جلال و رنگ و بو
مردِ حر کے خوف سے ہیں زرد رو

سرِ دیں ہم کو خبر، اس کو نظر
وہ درونِ خانہ، ہم بیرونِ در

ہم کلیسا دوست ہم مسجد فروش
دستِ احمدؐ سے ہے وہ پیمانہ نوش

نے مغاں کا بندہ، نے ساغر بدست
ہم تہی پیمانہ وہ مستِ الست

چہرۂ گل، اسکے نم سے احمریں
دُود بھی اس کا ہے گرم و آتشیں

اسکے سینہ میں ہے تکبیرِ امم
ہے جبیں میں اسکی تقدیرِ امم

قبلہ اپنا، گہہ کلیسا، گاہ دیر
وہ نہیں منت پذیر دستِ غیر

ہم کہ ہیں مردِ فرنگی کے غلام
عبدِ مولا بن کے ہے وہ شادکام

اس جہانِ رنگ و بو میں ہم نشین
وہ کسی صورت سما سکتا نہیں!

ہر گھڑی ہم کو ہے فکرِ ساز و برگ
کچھ نہیں اپنا بہ جز تلخیٔ مرگ

اس جہاں میں اس کو حاصل ہے ثبات
موت میں بھی اُسکی ہے رنگِ حیات

ہم سے مل کر اہلِ دل بھی مضمحل
گِل بھی اُس کے فیض سے دارائے دل

ہم کہ ہیں وابستۂ تخمین و ظن
صاحب کردار وہ اور کم سخن

ہم گدائے کوچہ گرد و فاقہ مست
لا اِلٰہ سے وہ سدا خنجر بدست

ہم بہ رگاہ اور اسیرِ گرد یار
ضرب اسکی کوہ دشمن، جو گشاد

اُس کا بن اور ہم سے اب بیگانہ بن
خانہ ویراں کر کے صاحب خانہ بن

آسمانوں کا گلہ، شکوہ نہ کر
رہ کے بن صحبت میں اُس کی زندہ تر

اُسکی صحبت کرتی ہے آدم گری
علم پہ حاصل ہے جس کو برتری

مردِ حر ہے ایک بحرِ بیکراں
اُس سے کر کچھ کسبِ فیض اے نوجواں!

سینہ ہے اُس کا تپاں مانندِ دیگ
کوہ بھی اسکے لیے اک تودہ ریگ

بزم میں وہ برگ و سازِ انجمن
صورتِ بادِ بہار اندر چمن

رزم کے میداں میں وہ مردِ جواں
اپنی خود تقدیر کا ہے راز داں

قبر اپنی دیکھتے ہی دیکھتے!
کھودتا ہے اپنی ہی شمشیر سے!

ہم سے رہ دور اے جوانِ خوش خرام
دامن اُس کا تھام، بے تابانہ تھام

بے نگاہِ اہلِ دل اے ہم نشیں
تخمِ دل سرسبز ہو سکتا نہیں

کچھ نہ کر پائے گا تو اے بے خبر
گر نہ تھامے دامنِ اہلِ نظر

اسرارِ شریعت میں

پیر رومی نے کیا مجھ پر یہ فاش
جس نے بخشا مجکو سوز و انتعاش

"مُل را گر بہر دیں باشی حمول
نعم مالٌ صالحٌ گوید رسولؐ"
(رومی)

گر نہ اس حکمت پہ ہو تیری نظر
تو غلام اور تیرے آقا سیم و زر

امتوں کی ہے غریبوں سے کشاد
اور منعم ایسے ہیں وجہہ فساد

جدت اسکے پاس ہے گویا خطا
کہنگی کو ڈھونڈتا ہے جو سدا

ناصواب اسکی نظر میں ہے صواب
ہے وہ ترساں سن کے نامِ انقلاب

لے گیا آقا زرِ مزدور بھی
آبروئے دخترِ مزدور بھی

بندہ اسکے آگے نالاں مثلِ نے
اُسکے لب پر نالہ ہائے پے بہ پے

مئے سے خالی اسکے سب جام وسبو
تشنہ و آشفتہ حال و کو بہ کو

کردئے تعمیر کتنے کاخ و کو !
خود مگر درماندہ و آشفتہ ہو

اے خوشا منعم کہ جو درویش ہو
اس زمانہ میں خدا اندیش ہو

گر نہ سمجھے نکتۂ اکلِ حلال
زندگی ہو جائیگی تجھ پر وبال

آہ یورپ اس سے کب آگاہ ہے
کب سوئے "ینظر بنور اللہ" ہے

ایک اسکو کیا حلال اور کیا حرام
حکمتِ اسکی خام عمل ہے نا تمام

امتوں کی امتوں پر ہے گذر
دانہ یہ بوئے وہ کاٹے، الحذر!

ہاتھ سے کمزور کے روٹی یہاں
چھیننا حکمت بڑی ہے اے جواں!

کھینچنا اسکے بدن سے اسکی جاں
ہے یہی کچھ دانشِ افرنگیاں

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری
پردۂ آدم دری، سوداگری!

جب چلا اِن بینکوں کا سلسلہ
سینۂ آدم سے نورِ حق گیا

ہو نہ وبالا نہ جب تک یہ نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

آدمی اندر جہانِ خیر و شر
جانتا ہے اپنا کم نفع و ضرر

کس نے سمجھا زشت و خوب کار کو
جادۂ ہموار و ناہموار کو !

شرع میں پوشیدہ ہے رمزِ حیات
روشن اسکے نور سے ہے کائنات

گر حرام اس کا سمجھ لیں ہم حرام
حشر تک پختہ رہے پھر یہ نظام

یہ نہیں کارِ فقیہاں ! اے پسر!
کر ذرا اس پر تامّل کی نظر

شرع کی ہے روح انصاف و رضا
اصل ہے اسکی ضمیرِ مصطفےٰ ؐ

ہجر سے گو آرزو ہے سینہ تاب
پر کہاں "تو" جب ہوا "وہ" بے حجاب

تو جدائی سے ہے گرچہ جاں بہ لب
وصل کیا "اسکی" رضا کو کر طلب

دی رضا سے اسکی ہادیؐ نے خبر
ہے یہی روحِ شریعت اے پسر

تختِ جم پنہاں ہے زیرِ بوریا
فقر و شاہی ہیں مقاماتِ رضا

حکمِ پیغمبر کو اے ناداں نہ ٹال
تا بہ کے بحث و جدال و قیل و قال

اسکے آگے کر سرِ تسلیم خم
تاکہ تیرا حکم بھی ٹالیں نہ ہم

شرع سے پھرا حسن التقویم بن
وارثِ ایمانِ ابراہیمؑ بن

پس طریقت کیا ہے؟ اے والاصفات
شرع کے سانچے میں ڈھل جائے حیات

چاہتا ہے سِرّ دیں گر فاش تر
رکھ ضمیر و دل پر اپنے تو نظر

ورنہ تیرا دیں ہے مجبوری کا نام
ذاتِ واجب سے فقط دوری کا نام

حق کو جب تک تو نہ دیکھے آشکار
حل نہ ہوگی رمزِ جبر و اختیار

بحرِ فطرت میں ہو اپنے غوطہ زن
مردِ حق بن، ظن و تخمیں پر نہ تن

تاکہ سمجھے زشت و خوبِ کار کو
اس جہانِ کہنہ کے اسرار کو

فاش جس پر ہو گیا سرّ نبیؐ
دُور کچھ اس سے نہیں جبریلؑ بھی

اے کہ تو رکھتا ہے قرآنِ عظیم
حجرہ میں کب تک رہے گا یوں مقیم

دہر میں اسرارِ دیں کو فاش کر
نکتۂ شرعِ مبیں کو فاش کر

ختم ہو ہر فرقِ محتاج و غنی
نکتۂ شرعِ مبیں ہے بس یہی

مکتب و ملّا سخن سازی میں گم
مومنو! سمجھو گے یہ نکتہ نہ تم

آہ تاویلات کی افسوں گری
خاک میں اک قوم جس سے مل گئی

شیخِ مکتب، صوفیانِ باصفا!
سب کو میں نے پاس سے دیکھا، سُنا!

کر رہا ہے ہر کوئی پیغمبری
خود سے ہٹ کر فکرِ قرآں ہی نہ کی

ہر کوئی دانائے قرآن و خبر
شرع کے میدان میں سب کم نظر

عقل و نقل اُن کے گرفتارِ ہوس
منبر اُن کا، منبرِ کاک اور بس

ان کلیموں سے توقع کچھ نہیں
بے ید بیضا ہے ان کی آستیں

کام قوموں کے نہیں ہونگے درست
حق ترے ہاتھوں میں ہے بیٹھ اب نہ سست

ھندوستانیوں کی پھوٹ پر چند آنسو

اے ہمالہ! اے اطلس! اے رودِ گنگ!
زندگی کب تک یونہی بے آب و رنگ

نوجواں سوزِ محبت سے ہیں دوٗر!
اور بوڑھے بھی فراست سے ہیں دوٗر!

شرق و غرب آزاد، ہم نخچیرِ غیر
ہر گھڑی ہی آمادۂ تعمیرِ غیر

زندگی جو ہو بہ رحمِ دیگراں !
اس کا حاصل موت ہے اے نوجواں

موت یہ افلاک سے آتی نہیں
زندگی ہی میں ہے تخم اس کا کہیں

صید اس کا مردہ شو چاہے نہ گور
نے ہجومِ دوستانِ نزدو دور

اسکے غم میں کون دامن چاک ہے
دوزخ اس کا کب سوئے افلاک ہے

حشر کے دن اسکو مت ڈھونڈ اے ندیم!
اسکا کل بھی آج ہی میں ہے مقیم

جو یہاں بوئے گا، کاٹے گا یہیں
پیشِ حق اسکو نہ لے جا ہم نشیں!

جس نے نیش آرزو کھایا نہیں
نقش اس امت کا رہ سکتا نہیں

ساحری ہے اعتبارِ تخت و تاج
ساحری سے مثلِ پتھر ہے زجاج

یہ بھی ہے اک طرح کا سحرِ مبیں
کافری سے کفر، دینداری سے دیں

اہلِ ہند اک دوسرے سے لڑ گئے
وہ پرانے فتنے پھر سے جاگ اٹھے

اک فرنگی قوم مغرب سے اٹھی
کفر و دیں کے بیچ ثالث بن گئی

کون جانے کیا ہے آب اور کیا سراب
انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب

ہر گھڑی تجھکو ہے فکرِ آب و گِل
کر طلب اللہ سے اک زندہ دِل

گرچہ اس کا آب و گِل میں ہے مقام
ہیں اسی دل میں نہاں سارے نظام

مت سمجھ تو کہ ہے وہ خاک سے
اس کا رشتہ ہے فقط افلاک سے

یہہ جہاں اسکے لئے ہے کوئے دوست
لالہ سے آئے اُسے خوش بوئے دوست

ہے زمانہ سے سدا گرمِ ستیز
ضرب سے اسکی ہے پتھر ریز ریز

دار اور منبر سے ہے وہ آشنا
خود محافظ ہے وہ اپنی آگ کا

آب جو ہے وہ سمندر ما جرا!
اور موج اس کی ہے طوفاں آشنا

زندہ و پائندہ بے نانِ و نمک
بے حضوری سے وہ پہونچے موت تک

ہے شبستانِ بدن کا وہ چراغ
خلوت و جلوت کو وہ بخشے فراغ

دل اور ایسا خود نگر، مولا صفات
صرف درویشی سے ہی آتا ہے ہاتھ

اے جوان خوش خرام و خوش سیر
دامن اسکا تھام بے خوف و خطر

تو غلامی میں ہوا پیدا مگر
اٹھ اور اسکے فیض سے آزاد مر!

سیاسیات حاضرہ

کرتی ہے بندِ غلاماں سخت تر
حرّیت کہتی ہے اسکو بے بصر

گرمیِ ہنگامۂ جمہور بھی
پردہ داری سی ملوکیت کی تھی

سلطنت کا نام اس نے رکھ دیا
جامعِ اقوام ——— اے صلِ علےٰ!

کام خاموشی سے پختہ کر گئی!
اور اسکو خام ہی کہتی رہی!

اس فضا میں کھُل نہ پائیں بال و پر
اُس کی چابی سے کھلے کوئی نہ در

کہتی ہے مرغِ قفس سے وہ یہاں
"خانۂ صیاد میں کر آشیاں

دشت میں ہوگا جو تیرا آشیاں
دستِ شاہیں سے نہ پائے گا اماں"

اُسکے افسوں سے ہے طائر دانہ مست
جسکے نالوں کا مقدر ہے شکست

حرّیت ہی چاہتا ہے تو اگر
دام میں اسکے نہ آئے بے خبر

خند خنداں تشنہ لب مرجا مگر
اسکی شاخِ تاک سے بچ کر گذر

گرمیِ گفتار سے اس کی حذر
حرفِ پہلو دار سے اس کے گذر

سرمہ سے، آنکھ، اسکے ہے بے نور تر
بندۂ مجبور ہے مجبور تر

الحذر! اسکی شراب ساتگیں
الاماں! اسکا قمارِ بد نشیں

ہاں کبھی غافل خودی سے ہونے تو
حبتِ افیون اسکی کھا کر سو نہ تو

آگے فرعونوں کے کہہ حرفِ کلیم
تا ہو تیری ضرب سے دریا دو نیم

کارواں یہ! اور میرِ کارواں
جس کے سینہ میں نہیں ہے نورِ جاں

تن پرست و جاہ مست و کم نگاہ
ہے درؤں جس کا تہی از لا الٰہ

گرچہ وہ اٹھا حرم کی خاک سے
زندگی اُسکی کلیسا کیلئے

اور ہمارا پردۂ ناموسِ دیں!
کردیا ہے چاک اس نے ہمنشیں!

دامن اس کا تھامنا ہے ابلہی
سینہ اس کا قلب روشن سے تہی

تکیہ کر خود پر ہی اے غفلت شعار
اندھے کتوں سے نہ کر آہوٗ شکار

قوم یہ، جو آہ! خود سے ہے نفور
دے کے غیر اللہ کو دل خود سے ہے دور

اسکے سینہ میں خودی جب مرگئی
کوہ میں کاہی سرایت کر گئی

لاالہ سے گرچہ ہے شورش بجاں
بطن میں اس کے مسلماں ہے کہاں

بخشش دے جو بے یقینوں کو یقیں
جس کے سجدوں سے لرز اٹھے زمیں

زیرِ خنجر جس کے لب پر لا الہ
جس کے خوں سے ہو فزوں تر لا الہ

وہ سرور و سوزِ مشتاقی نہیں
کوئی صاحبدل یہاں باقی نہیں

اے مسلمان! آہ یہ دیر کہن
تا کجا یہ قید و بندِ اہرمن

جہد با توفیق اور ذوقِ طلب
کس نے پائے بے نیاز نیم شب

زندگی کب تک تری مانند خس
سخت ہو جا سیکھ کر ضبط نفس

گرچہ دانا حال دل کہتا نہیں
تجھ سے درد اپنا چھپا سکتا نہیں

ہوں غلام اور بندۂ مجبور ہوں
آستانِ کعبہ سے بھی دُور ہوں

بھیجتا ہوں جب محمدؐ پر درُود
شرم سے ہو جاتا ہے پانی وجُود

عشق کہتا ہے کہ "اے محرومِ غیر
سینہ تیرا ہے بتوں سے مثلِ دَیر

جب نہیں تجھ میں کچھ اُس کا رنگ و بُو
پڑھتا کس منہ سے درُود اس پر ہے تو"

آہ یہ میرا قیام بے حضُور
آہ یہ میرے سجُودِ بے سرُور

جلوۂ حق گرچہ ہے دو اک نفس
قسمتِ آزاد مرداں میں ہے 'بس'

مردِ آزاد' آہ وہ اُس کے سجُود
گرد جس کے پھرتا ہے چرخِ کبُود

ہم نے دیکھا ہی کہاں اُس کا جلال
اور یا اُس کا جمالِ لازوال

بندگاں میں لذتِ ایماں نہ ڈھونڈ!
گرچہ ہوں وہ حافظِ قرآن، نہ ڈھونڈ!

ہے وہ مومن، پیشہ اُس کا آذری
دین و عرفاں اسکے یکسر کافری

ہو بدن میں تیرے گر سوزِ حیات
پھر تو معراجِ مسلماں ہے صلوٰات

خالی، خونِ گرم سے، تیرا بدن
سجدہ تیرا کیا ہے؟ اک رسمِ کہن

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں!

اُمتِ عربیہ سے خطاب

اے کہ دشت و در رہے تیرا اسدا
نعرۂ لا جم و کے کس نے دیا؟

اس جہانِ آب و گِل میں یہ بتا
قارئِ قرآن پہلا کون تھا؟

کس نے الا اللہ کا پایا سُراغ؟
کس جگہہ روشن ہوا تھا یہ چراغ؟

علم و حکمت آئے کس کے خوان میں؟
اور "فَاَصْبَحْتُمْ" ہے کس کی شان میں؟

دم سے اس امّی لقبؐ کے بن گیا
یک بہ یک دشتِ عرب گلزار سا

حُرّیت جاگی اُسی آغوش سے
اُمتوں کا "آج" اس کے "دوش" سے

پیکرِ آدم میں دل اُس نے رکھا
روئے آدم سے ہر اک پردہ اٹھا

کردیا ہر بت کو اُس نے ریزہ ریز
اُس کے نم سے شاخِ کہنہ غنچہ ریز

گرمیٔ ہنگامۂ بدر و حنین
حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ

جنگ کے میدان میں بانگِ صلوٰت
عینِ میدانِ وغا "الصّٰفّٰت"

تیغ ایوبیؒ نگاہِ بایزیدؒ
دونوں عالم کے خزانوں کی کلید

عقل و دل کی مستی اُسکے جام سے
اختلاط ذکر و فکر روم و رے

علم و حکمت، شرع و دیں، نظم امور
اندر سینوں میں وہ دل ناصبور

حسنِ عالم سوزِ الحمرا و تاج!
لے رہا قدسیوں سے جو خراج

یہ سب اُس کے وقت کا اک لحظہ ہے
اس کے جلووں کا فقط اک جلوہ ہے

ظاہر اُس کا سب یہ جلوے دل فروز
عارفوں سے ہے نہاں باطن ہنوز

"ہو بیاں اونچا رسولِ پاک کا
جس نے مشتِ خاک کو ایماں دیا"

حق نے تجھکو تیز خنجر سا کیا
ساربان راکب بنا تقدیر کا!

بانگِ تکبیر و صلوات و حرب و ضرب
جس کا مقصد تھا کشادِ شرق و غرب

واہ! وہ مجذوبی و دل بُردگی!
آہ! یہ دل گیری و افسردگی!

ساری قومیں آ رہی ہیں دو بدو
اپنے صحرا کی نہ جانے قدر تو!

ایک اُمت اُمتوں میں بٹ گئی
انجمن تیری پراگندہ ہوئی!

موت ہے بندِ خودی کو توڑنا
اور بیگانوں سے رشتہ جوڑنا

تو نے کی ہے آپ سے وہ دشمنی
روحِ پاکِ مصطفےٰ بھی رو اٹھی

ہے فرنگی کے فسوں سے بے خبر
کر ذرا تو اُس کے فتنوں پر نظر

مکر سے اُس کے جو بچنا ہے تو جا
اونٹ اس کے حوض سے اپنے ہٹا

اس کی حکمت سے تہ قومیں یہاں
پارہ پارہ وحدتِ اعرابیاں

جب کمند اُس کی عرب پر آ گری
آسماں نے پھر اماں اس کو نہ دی

صحرا اپنا دیکھ اے صاحب نظر
خود میں کر پیدا وہی روحِ عمرؓ

کیا ہے قوت؟ سطوتِ دینِ مبیں
دین کیا ہے؟ عزم و اخلاص و یقین

قلب جب تک رازداں فطرت کا ہے
مردِ صحرا پاسباں فطرت کا ہے

طبع اُس کی ہے عیارِ زشت و خوب
اسکی تابش سے ہزار انجم غروب

کوہ و دشت و دامن و در سے گذر
اٹھ کے پھر اپنی خودی میں خیمہ کر

طبع کر بادِ بیابانی سے تیز
منتظر تیرا ہے میدانِ ستیز

زادۂ دوراں ترا، عصرِ رواں!
تیری مئے سے اسکی ساری مستیاں

شارحِ اسرار اس کا تو ہی ہے
اوّلیں معمار اس کا تو ہی ہے!

لے کے فرزندی میں اپنی اب فرنگ
کر گیا اس کو بتِ بے نام و ننگ

گرچہ وہ شیریں بھی ہے، نوشیں بھی ہے
کج خرام و شوخ اور بے دیں بھی ہے

مردِ صحرا! پختہ تر کر خام کو!
رکھ فساں پر اپنے پھر ایام کو

پس کیا کیا چاہیئے اقوامِ شرق

آدمیت زار زار افرنگ سے
زندگی ہنگامہ بار افرنگ سے

پس کیا کیا چاہیئے اقوامِ شرق؟
تاکہ روشن ہو سکیں ایّامِ شرق!

جس میں برپا ہو گیا اک انقلاب
رات گذری اور نکلا آفتاب

یورپ اپنی تیغ سے گھائل ہوا
رسمِ لادینی پہ جب مائل ہوا

کھال میں ہے بھیڑ کی اک بھیڑیا
ہر گھڑی ہے فکر جس کو بھیڑ کا

اس کی پیدا کردہ ہیں سب مشکلات
آدمیت کا ہے ناسور اُس کی ذات

آب و گِل اسکی نظر میں آدمی
بے دِرا ہے کاروانِ زندگی

ہیں نمایاں ہر طرف انوارِ حق
حکمتِ اشیا ہے کیا؟ اسرارِ حق!

جس نے آیاتِ خدا پر کی نظر
پس وہی ہے مردِ حُر! اے بے خبر

حکمِ "اُنظُر" پر ہو گر تیری نظر
تجھ پہ کھُل جائیں گے اس حکمت کے در

مردِ مومن اس سے ہے بہروزتر
دوسروں کے حال پر دل سوزتر

علم سے روشن اگر ہو آب و گِل
پھر خدا سے اور بھی ترساں ہو دِل

علم اَشیاء ہم کو علمِ کیمیا
پر ہے تاثیر اس کی یورپ میں جُدا

عقل و فکر اس کی نہ سمجھے خوب و زشت
آنکھ بے نم، دل مثالِ سنگ و خشت

علم کو رسوا یہاں اس نے کیا
جبرئیل ابلیس بن کر رہ گیا

ہاتھ میں اُس کے ہے اک تیغِ دو دم
قتلِ انساں پر ہے مائل دم بہ دم

ہو بھلا ان ناکسوں کو کیا خبر
کیا ہے آخر مستیِ علم و ہنر

آہ! یورپ کا یہ دستورِ زیاں
اس کی یہ لادینیِ فکر الاماں!

علمِ حق کو ساحری اُس نے سکھائی
ساحری کیا، کافری اُس نے سکھائی

بند کر فتنوں کا یہ دراے پسر!
پنجۂ رہزن سے خنجر چھین کر!

فکرِ تن کے ساتھ جاں کو بھی نہ چھوڑ
سحر اس تہذیبِ لادیں کا بھی توڑ

روحِ شرق اس کے بدن میں جاگ اٹھے
تاکہ ہر قفلِ معانی کھل سکے

تابعِ دل ہو تو یزدانی ہے عقل
دور ہو دل سے تو شیطانی ہے عقل

زندگی ہر دم ہے محوِ کشمکش
کتنا پُر عبرت ہے احوالِ حبش

شرعِ یورپ میں بغیرِ قیل و قال
بھیڑیوں پر بھیڑ ٹھہری ہے حلال!

رکھ زمانہ میں اب اک نقشِ جدید
اِن کفن چوروں سے کیا کوئی اُمید

کچھ جنیوا میں نہیں جز مکر و فن
صید وہ تیرا ہے یہ نخچیرِ من!

نکتہ جو لائے نہ کچھ تابِ سخن
اک جہاں آشوب، اک گیتی فتن

یوں نہ اے ناداں! اسیرِ رنگ ہو
مومنِ خود، کافرِ افرنگ ہو

رشتۂ سود و زیاں ہے تیرے پاس
آبروئے خاوراں ہے تیرے پاس

کر اب ان اقوام کو شیرازہ بند
پرچمِ صدق و صفا کو کر بلند

اہلِ حق کی زندگی قوت سے ہے
قوتِ ملت سو جمعیت سے ہے

رائے بے قوت ہے اک مکر و فسوں
قوتِ بے رائے اک جہل و جنوں

ایشیا ہے مایہ دارِ درد و داغ
حاملِ دُرد و مئے و جام و ایاغ

عشق کو آدم گری ہم نے سکھائی
دلنوازی، دل بری ہم نے سکھائی

خاکِ خاور سے ہیں سب دین و ہنر
رشکِ گردوں ہے یہ خاک اے بے خبر

ہم نے ہر شئے کو کیا ہے بے حجاب
اُس سے ہم ہیں اور ہم سے آفتاب

ہر صدف کو ہم نے بخشا ہے گہر
ہے ہمیں سے شوکتِ ہر بحر و بر

خونِ آدم ہے رگِ گل میں رواں
روح اپنی سوزِ بلبل میں رواں

ہیں ہمیں جویائے اسرارِ وجود
اوّلیں زخمہ گرِ تارِ ——— وجود!

اپنے سینہ میں نہاں رکھتے ہیں داغ
رکھ دیا لاکر سرِ رہ وہ چراغ

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں
رکھ یدِ بیضا نہ زیرِ آستیں

اُٹھ کہ ہے تیرا جہاں کو انتظار
نشۂ افرنگ اب سر سے اُتار

کر تو کر جمعیّتِ خاور کی بات
خود کو دستِ اہرمن سے دے نجات

الاماں یہ زشتیِ کارِ فرنگ
توڑ دے ہر دام زنّارِ فرنگ

ہے اُسی سے جوئے خوں، زخمِ گلو
اور ہم کو اُس سے اُمیدِ رفو

بادشاہی میں نہاں ہے قاہری
قاہری ہے آجکل سوداگری

ہو کے سوداگر شریکِ تخت و تاج
لے رہے ہیں تاجِ شاہی سے خراج

ہے یہ سودا گر کچھ ایسا اے پسر!
خیر ہے جس کی زباں پر دل میں شر

کچھ حساب اُس کا سمجھ اے بے خبر
ریشم اس کا ٹاٹ سے تیرے بتر

بیچ کر اُس سے بے نیازانہ گذر
اُس سے مر کر بھی کوئی سودا نہ کر

مارنا بے حرب و ضرب اس کا نظام
موت کا اُسکی مشینوں میں خرام

اُس کا قالیں لے کے مت دے بوریا
بدلے فرزیں کے، پیادہ مت کھپا

گوہر اُس کا عیب دار و کم عیار
نافِ سگ سے مشک اُس کا مستعار

رہزنِ چشم اُس کا خوابِ مخملیں
تیرا رہزن رنگ و آبِ مخملیں

ڈال کر سو بیچ اپنے کام میں
یوں نہ آنا دان! اُس کے دام میں

اُس کے خُم سے پی نہ مئے اے ہوش مند
جس کا حاصل موت ہے اے ہوش مند

وقتِ سودا ہے وہ خنداں اور خموش
ہم ہیں مثلِ طفل وہ شکّر فروش

ہے وہ آگاہِ مزاجِ مشتری!!!!
سحر ہے یارب کہ یہ سوداگری!!!!

ہے یہ تاجر چرب دست و نفع ور
ہم خریداران بے سمع و بصر

جو تری مٹی سے پیدا ہو ثمر
ہو کے قانع بس اُسی پر کر بسر!

ہیں جو مردانِ خود آگہہ اے ندیم!
خود وہ سی لیتے ہیں آپ اپنی گلیم

کر ذرا اے کم نگاہ و بے خبر
چرب دستی ہائے یورپ پر نظر

تیرے ہی ریشم سے اک قالیں بُنا
سامنے تیرے وہی پھر لا رکھا

دیکھ کر تو اس کو دھوکا کھا گیا
دام میں کس سادگی سے آ گیا

اُف وہ دریا گم ہے جس کی موج بھی!
گوہر اپنا مانگے غواصوں سے ہی!

حضورِ رسالت مآبؐ میں

تیسری اپریل ۱۹۳۶ء دارالاقبال بھوپال میں تھا کہ سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ فرمایا کہ "اپنی علالت کے بارے میں حضور رسالت مآبؐ میں عرض کر!"

اے کہ ہے تو ہی ہمارا آسرا
کر اجل کے خوف سے ہمکو رہا

پُشت پا اصنام پر تو نے رکھا
کائناتِ کہنہ کو تازہ ــــــ کیا

ذکر و فکرِ انس و جاں کا یہ جہاں
تو صلوٰت اس کی ہے تو بانگِ اذاں

لا اِلٰہ سے لذت و سوز و سرور
ہے شبِ اندیشہ میں اس سے ہی نور

گاؤ و خر کو ہم نہیں کہتے خُدا!
اور نہ آگے کاہنوں کے سر رکھا

کوئی معبودِ کہن پوجا نہیں
میر و سلطاں پر کیا تکیہ نہیں

ہے یہ سب کچھ لطفِ بے پایاں ترا
ہے ہماری فکر پر احساں ترا

ذکر تیرا مایۂ ذوق و سرور
فقر میں بھی قوم ہے تیری غیور

تو ہی تو ہے منزلِ ہر راہ رو
تیرا جو یا ہے دلِ ہر راہ رو

بے صدا اپنا ہوا سازِ فغاں
زخمہ بھی اُس پر گذرتا ہے گراں

میں نے دیکھا کیا عجم اور کیا عرب
مصطفیٰؐ نایاب، ارزاں بولہب

گو مسلماں زادہ ہے روشن دماغ
ہے ضمیر اس کا سیاہ اور بے چراغ

ہے جوانی میں وہ نرم و ریشمی
آرزو سینہ میں اُس کے مر چکی

یہ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
حرّیت ہے فکر میں اُس کی حرام

جذبۂ دیں اُس کا مکتب کھا چکا
ہاں وجود اس کا کبھی شاید کہ تھا

خود سے یہ بیگانہ، یہ مستِ فرنگ
بہر ناں منت کشِ دستِ فرنگ

بہرِ روزی بیچتا ہے جانِ پاک
دیدیئے مجکو یہ نالے سوز ناک

دانہ چیں ہے مثلِ مرغانِ سحر
ہے فضائے نیلگوں سے بے خبر

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر
اُس کی منزل کی نہ دی اُس کو خبر

آتشِ افرنگ سے وہ گھُل گیا
یعنی اس دوزخ میں ناداں! جل اٹھا

ہے وہ رمزِ مرگ سے آگہ کہاں
اس کے دل میں غالب الّا اللہ کہاں

دل ہی جب سینہ میں اُس کے مر چکا
کچھ نہ جانے کھانے، سونے کے سوا

لاکھ نشتر ایک روٹی کے لئے
پیٹ کی خاطر ہزار احساں اٹھائے

کھا گیا افرنگ کے لات و منات
مومن اور اندیشہ اُس کا سومنات

قُمْ بِاِذْنِی کہہ کے اس کو زندہ کر
اسکے دل میں ذکرِ حق پائندہ کر

ہم کہ ہیں افسونِ تہذیبِ غرب
کشتۂ افرنگ ہیں بے حرب و ضرب

قوم میں، جس کا مقدر ہے شکست
کر عیاں اک بندۂ اللہ مست

تا مسلماں پھر سے دیکھے آپ کو
اس بھری دنیا میں سمجھے آپ کو

شہسوارا! ایک پل کو تو ٹھہر
حرفِ شوق آتا نہیں لب پر مگر

آرزو آئے زباں پر یا نہیں؟
شوق محکومِ ادب ہوتا نہیں

وہ کہے مجھ سے کہ "ہاں! ہو لب کشا"
یہ کہے "لب بند کر، نظریں اٹھا"

گرد تیرے گھومتی ہے کائنات
میرے مولاؐ ایک چشمِ التفات

ذکر و فکر و علم و عرفاں تو مرا
کشتی و دریا و طوفاں تو مرا

میں ہوں اک آہوئے زبوں زار و نزار
کوئی کرتا ہی نہیں میرا شکار

ہے پنہ میری فقط کوچہ ترا
اک توقع پر میں تجھ تک چل پڑا

وہ نوا سے سینہ کو بھرنا کہاں
وہ نفس سے غنچہ وا کرنا کہاں

نغمہ میرے ہی گلے میں پھنس گیا
شعلہ سینہ سے نہ باہر آ سکا

سانس سے سوزِ جگر جاتا رہا
لطفِ قرآنِ سحر جاتا رہا

تھام سکتا ہی نہیں جسکو ضمیر
نالہ وہ کب تک ہو سینہ میں اسیر

ہے وہ جویائے فضائے بیکراں
خواستگارِ وسعتِ نہ آسماں

درد جو اس جان و تن میں ہے بھرا
اس کا درماں؟ گوشۂ چشم آپکا!

ہے دوا بیزار میری جان زار
تلخ بو جس کی ہے مجکو ناگوار

کام اس بیمار کا کیونکر چلے!
جو دوا سے مثلِ طفلاں روپڑے

اس کی تلخی کو وہ بتلائے شکر
مجکو ہنس ہنس کر پلائے چارہ گر

میں بصیری کی طرح آقاؐ مرے
چاہتا ہوں توؐ مرا درماں کرے

عاصیوں پر ہے کرم افزوں ترا
ہے خطا بخشی میں تو، ماں سے سوا

میں کہ اہلِ شب سے ہوں اب دوبدو
ڈال پھر مرے دیئے میں تیل تو

اے کہ تیری ذات سرتا پا بہار
پر تو اپنا میرے اوپر بھی اُتار

"قدر جو بھی تن کی ہے وہ جاں سے ہے
قدرِ جاں بھی پر توِ جاناں سے ہے"

کیوں ہو غیر اللہ سے مجکو اُمید
یا بنا شمشیر مجکو یا — کلید

فہم دیں میں فکر تو چالاک ہے
بے عمل لیکن یہ مشتِ خاک ہے

تیشہ میرا تیز تر کر دے کہ میں
ساتھ میں رکھتا ہوں بے حد محنتیں

میں ہوں مومن، خود سے میں کافر نہیں
رکھ فساں پر تو، کہ بد گوہر نہیں

گرچہ میری عمر ہے بے رنگ و نور
ایک دل سینہ میں رکھتا ہوں ضرور

جس پر اک عالم کی نظروں سے نہاں
ہے ترے شبدیز کے سُم کا نشاں

بے حضورِ خواجہؐ میری زندگی!
موت سے بد تر ہے ایسی زندگی!

تو نے بخشا کُرد کو سوزِ عرب
کر مجھے دربار میں اپنے طلب

مثلِ لالہ رکھتا ہوں داغِ جگر
میرے غم سے دوست میرے بیخبر!

میں کہ نالاں ہوں جہاں میں مثلِ نے
اٹھ رہے ہیں جس سے نغمے پے بہ پے

دشت میں ہوں مثلِ چوبِ نیم سوز
جا چکے سب، جل رہا ہوں میں ہنوز

اس بیاباں میں عجب کیا ہے کبھی
کارواں شائد نکل آئے کوئی

سوزِ فرقت سے ہے نالاں میری جاں
وائے میں! اے وائے یہ میری فغاں

تلمیحات وتشریحات

الف

اُنظُر: آیۂ قرآنی: فَانظُر اِلَی الاَبِلِ
یعنی نظام فطرت کا بغور مطالعہ کرو

انتعاش: بلند ہونا

احسن التقویم: آیۂ قرآنی: یعنی وجودِ انسانی کی ساخت احسن طریق پر ہوئی ہے

ابلہی: بیوقوفی

الصّفّت: والصّفّتِ (قرآن)

ایوبیؒ: غازی سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

الحمرا: ہسپانیہ میں مسلمانوں کا تعمیر کردہ ایک محل

اشتر: شتر، اونٹ

اُدعونی: آیۂ قرآنی، اُدعونی اَستجب لکُم یعنی دعا کرو میں قبول کرنے والا ہوں

اِنّی قریب: آیۃ قرآنی، یعنی میں قریب ہوں۔

آفاق گیر: کائنات کا فاتح

آنی: لمحاتی، فانی

ارباب کیں: بُرے لوگ

با

بے مرؤر: نہ ختم ہونے والا

برگزیدہ: بزرگ و برتر

بایزیدؒ: حضرت بایزید بسطامیؒ

بتر: بدتر

بصیری: مشہور قصیدہ بردہ شریف کا مصنف۔ روایت ہیکہ یہ قصیدہ بارگاہ نبویؐ میں مقبول ہوا اور مصنف کو فالج کی بیماری سے نجات ملی

برگ وبر: پھل اور پتے۔

بندۂ درماندہ: مجبور آدمی

پا

پشتِ پا: تلوا

پشہ: مچھر

تا

تخریب: توڑنا، گرا دینا، برباد کرنا

تیغِ آختہ : کھنچی ہوئی تیغ
ترسِ مرگ : موت کا ڈر
ترساں : ڈرنے والا
تاج : تاج محل آگرہ

ج

جوئے سیمیں : چاندی کی ندی یعنی چاندنی
جوکشاد : ندی نکالنے والی
جم : جمشید، ایک قدیم ایرانی حکمراں
جدال : لڑائی

چ

چرب دستی : کاریگری
چوب کلیم : حضرت موسیٰؑ کا عصا
چرخِ کبود : نیلا آسمان

ح

حمول : متحمل، باربردار

خ

خجل : شرمندہ
خزف : ٹھیکری
خیز : اُٹھ
خردہ گیری : چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دینا
خشت : اینٹ
خاور یا خاوراں : سورج : مراد مشرق یا اقوام مشرق

د

دؤد : دھنوان
دے : اہلِ ایران کا دوسرا مہینہ جس میں خزاں کا موسم رہتا ہے۔
دونیم : دو ٹکڑے
دل باختہ : دل پھینک
دوں نہاد : فطرتِ بد

ر

روم و رے : حضرت جلال الدین رومی اور امام فخر الدین رازی مراد ہیں
رمِ موج : موج کی حرکت
راہ بیں : راستہ کو دیکھنے والا
ریگ : ریت
رفت و بود : آنی جانی
رستخیز : قیامت

ز

زجاج : شیشہ

زشتی اندیشہ : خراب فکر
زمین شورہ زار : خشک و بنجر زمین

ژ

ژرف : گہرائی

س

سِرّ : راز
سیم ناب : خالص چاندی
سلف : آباؤ اجداد
ساختہ پرداختہ : بنی ٹھنی
ستیز آرائی : لڑائی
سریر : تخت و تاج
ساتگیں : شراب کا پیالہ

ش

شبدیز : مشکی گھوڑا

ص

صدف : سیپی
صواب : مناسب

ع

علّم الاسما : آیۂ قرآن - ہم نے آدم کو اسما کا علم سکھایا۔
عمق : گہرائی

غ

غواص : غوطہ لگانے والا

ف

فرودیں : فروردی - بہار کا مہینہ
فاصبحتم : آیۂ قرآنی، فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانا
فساں : سان

ق

قیصر و کے : قیصر و کسریٰ قدیم ایرانی بادشاہ
قم باذنی : اُٹھ میرے حکم سے
قیل و قال : بحثا، بحثی

ک

کاف و نوں : مراد کن ہے یعنی یہ جہاں جو لفظ کن سے ظہور پذیر ہوا۔
کہہ : کاہ کا مخفف یعنی گھاس
کاخ و کو : مکان اور گلی کوچے
کُرد : ایران و عراق کی سرحد پر بسنے والی ایک جنگجو قوم
کاوس و کے : قدیم ایرانی حکمران
کوَر : اندھا

گ

گردوں مسیر : آسمانوں کی سیر کرنے والا

گلو : گلا

گلیم : کمبل

ل

لاینام : نہ سونے والا

لاخوف علیھم : آیہ قرآنی یعنی مومن خوف وغم سے پاک ہیں۔

لاتخف : آیہ قرآنی یعنی خوف نہ کر

م

مہجور : فراق زدہ، دور

مستعار : مانگا ہوا، اُدھار

مبنر کاک : کاک ایک قسم کی چھوٹی روٹی مبنر کاک اس چوبی میز کو کہتے ہیں جس پر نانبائی روٹی رکھ کر بیچتا ہے

مردہ شو : مردہ کو غسل دینے والا غسال

نیلی رواق : نیلی چھت یعنی آسمان

نخل : درخت

ناصبور : بے قرار، بے صبر

نفور : نفرت کرنے والا

نوامیس : جمع ناموس، مراد قدرت کی پوشیدہ قوتیں۔

نعم مالٌ صالح : یہ شعر مولانا روم کا ہے۔ جس میں یہ حدیث نبوی بیان کی گئی ہے کہ اگر مال و دولت دینی امور پر خرچ کرنے کیلئے جمع کیا جائے تو وہ مالِ صالح ہے۔

نالۂ عاشق بگوش ۔۔۔ الخ : یہ شعر غالباً علامہ ہی کا ہے جس کا مطلب ہے کہ عاشق کے نالے اہلِ دنیا کے نزدیک اتنے ہی بے اثر ہیں جتنی دیارِ فرنگ میں بانگِ اذاں۔

ھ

ہم نفس : دوست، ساتھی

ہستی و بود : زندگی

ہیزم : جلانے کی لکڑی

ی

ینظر بنور اللہ : تلمیح ہے حدیث نبوی کی طرف جس کا مطلب ہے کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔